مشقِ سخن

مضامین، تقاریر و تحاریر

پروفیسر (ر) نصیر احمد چودھری

مشقِ سخن

مضامین، تقاریر و تحاریر

پروفیسر (ر) نصیر احمد چودھری

پروفیسر نصیر احمد چودھری معروف ماہرِ تعلیم ہیں۔ اُردو زبان و اَدب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ عمر بھر تعلیم و تدریس سے وابستہ رہے اور ہزاروں تشنگانِ علم کو ایک مدت تک سیراب کرتے رہے۔ کلاسیکی ادب اور اقبالیات سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ زندگی اور زندگی سے جڑے ہوئے معاملات کا گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں۔ اِس لیے ان کے مضامین میں تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کی یادداشتوں اور مضامین کا پہلا مجموعہ "راہِ سخن" قارئین سے بھرپور دادِ سخن وصول کر چکا ہے۔ "راہِ سخن" نے قارئین سے بھرپور پذیرائی حاصل کی۔ انھوں نے زندگی بھر کے تجربات و مشاہدات کو "راہِ سخن" میں انتہائی خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔

پروفیسر صاحب کی زیرِ نظر کتاب "مشقِ سخن" بھی زندگی بھر کے انھی تجربات و مشاہدات کا بیان ہے جن کا ایک بڑا حصہ آپ "راہِ سخن" میں پڑھ چکے ہیں۔ "مشقِ سخن" میں آپ کو مختلف موضوعات پر متنوع قسم کے مضامین بھی ملیں گے، علمی و ادبی تقاریر بھی ملیں گی اور ایسے خطوط بھی ملیں گے جن کے ذریعے قاری اپنی علمی پیاس بجھا سکتا ہے اور ایسے مکالمے بھی ملیں گے جن میں تاریخ، معاشرت اور تعلیم کو خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب "مشقِ سخن" جہاں عام سنجیدہ قاری کے لیے اپنے اندر دلچسپی کا سامان رکھتی ہے وہیں طلباء طالبات کی تعلیمی ضروریات کو بھی پورا کرتی ہے۔ امید واثق ہے کہ اِن شاء اللہ یہ کتاب "راہِ سخن" کی طرح قارئین کی بھرپور توجہ اور پذیرائی حاصل کرنے میں کامیاب ٹھہرے گی۔

اشرف نقوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نصیر احمد چودھری

نام کتاب:.......................... مشق سخن

مصنف: .... نصیر احمد چودھری

قانونی مشیر: .... نعمان نصیر (ایڈووکیٹ)

فون نمبر:.......................... 0333-0441857

سالِ اشاعت:.......................... 2024ء بمطابق ۱۴۴۶ھ

ایڈیشن:.......................... اوّل

مشینی خطاطی: .... اشرف نقوی 0345-6352439

سرِورق:.......................... اشرف نقوی

مطبع:.......................... ایم جے آرٹ پریس، لاہور

قیمت: .... فی سبیل اللہ (برائے ایصالِ ثواب والدین)

برائے رابطہ مصنّف:

نصیر احمد چودھری

اسسٹنٹ پروفیسر (ر) شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج شیخوپورہ

مکان نمبر 67، گلی نمبر 3، مجاہد نگر، وارث روڈ، شیخوپورہ

فون نمبر: 0333-5002319
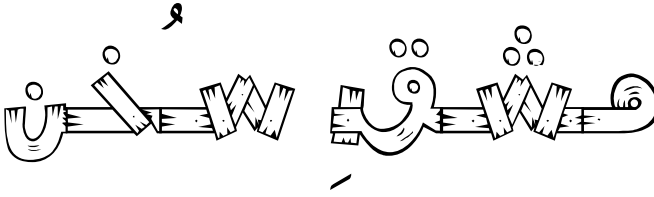
ہے مشق سُخن جاری ، چکّی کی مشقّت بھی
اِک طُرفہ تماشا ہے، حسرت کی طبیعت بھی

نصیر احمد چودھری

انتساب
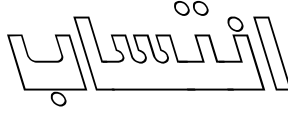
پاک وطن کے روشن نظر اور

پاک باطن احباب

کے نام

فہرست مضامین

فہرست بابِ اوّل

عرضِ مصنّف، غرضِ تصنیف

جیسا کہ ’’راہِ سخن‘‘ میں عرض کیا گیا تھا کہ مختلف اوقات میں چند تحریریں لکھی پڑھی تھیں ایسے ہی چند تقاریر اور کچھ مضامین وقتاً فوقتاً عرض مند متعلمین و مقررین کے لیے لکھے گئے تھے۔ جب دیکھا تو اُن میں سے چند تقاریر اور بعض مضامین کو اِس قابل سمجھا کہ افادۂ عام کے لیے چھپوا دیا جائے۔ اُن کے ساتھ ہی ابتدائی طور پر چند اخلاقی کہانیاں بھی لکھ دی ہیں تا کہ انسانی اقدار کے ساتھ نسلِ نو کا دامن بندھا رہے اور بندہ کو تا حیات ان اقدار سے بہرہ ور ہونے کا شرف حاصل رہے۔ اب جب دوستوں سے اِس دوسری کتاب ’’مشقِ سُخن‘‘ کی اشاعت کے بارے میں ذکر کیا تو اُنھوں نے اُسی روایتی انداز میں حوصلہ دیا اور ہمت بندھائی۔ پھر ’’راہِ سخن‘‘ پر دوستوں کے حوصلہ افزا جملے، اخباری تبصرے، تحریری خطوط اور داد بھرے تنقیدی مضامین کے سبب اِس میدان میں دوبارہ اُترنے کا قصد کیا ہے۔ قابل قدر احباب کی ’’راہِ سخن‘‘ پر تحریریں بھی ’’دادِ سخن‘‘ کے نام سے اِس کتاب میں شامل کر دی گئی ہیں۔ قبولِ خاطر کا مرحلہ تو ہمیشہ اہلِ نظر قارئین کا حصّہ ہی رہا ہے۔ البتہ کتاب کی خوبیاں توفیقِ اِلٰہی کے باعث ہیں اور لغزشیں انسانی نفسِ خطا کار کے سبب ہوتی ہیں۔

اللہ پاک ستّار العیوب ہے وہی خطا کار انسانوں کی لغزشوں پر پردہ ڈالتا ہے تا کہ حُسن و زیبائی ظاہر ہو اور نقص و عیوب پوشیدہ رہیں۔

نصیر احمد چودھری

اسسٹنٹ پروفیسر (ر) شعبہ اُردو

گزشتہ سے پیوستہ

(احباب کے مشورے)

’’راہِ سخن‘‘، چھپی۔ دوستوں، شاگردوں، چاہنے والوں اور جاننے والوں میں تقسیم ہوئی۔ سب ہی خواہوں نے دادِ سخن دے کر حوصلہ افزائی کی۔خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھیں ایسے قابل قدر احباب میسّر آئیں۔ایک شاگردہ کتاب لے کر گئی۔ جاتے ہی پڑھنا شروع کی۔شام سے پہلے موبائل پر بیل ہوئی۔اُس نے کہا:’’سر! آپ نے’’قضائے اِلٰہی‘‘لکھا ہے،’’رضائے اِلٰہی‘‘نہیں ہونا چاہیے تھا؟‘‘میں نے کہا:’’وفات کی خبر ایسے ہی دی جاتی ہے۔والد صاحب ایک شعر پڑھا کرتے تھے۔بہت پہلے سُنا تھا،آپ بھی سُن لیں۔

لائی حیات، آئے،قضا لے چلی، چلے　　　اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے‘‘

منصور احمد اعوان صاحب نے نہایت دیدہ ریزی سے مطالعہ کیا ہے۔کتابت یا کمپوزنگ کی چند غلطیوں کی نشان دہی کی ہے اُنھیں درست کرلیا ہے۔اُن کی راہ نمائی کا شکریہ۔ لیکن ایک جگہ اُنھوں نے بتایا ہے کہ’’مرادف‘‘ کی جگہ’’مترادف‘‘ کرلیا جائے۔عرض ہے کہ زبانوں کا معاملہ نہایت نازک ہے۔کوئی لفظ بھی دوسرے کا مترادف نہیں ہوتا۔’’مرادف‘‘ ہی ہوتا ہے۔ الفاظ میں یکسانیت نہیں اشتراکیت ہوتی ہے۔اپنی بات کو دو مثالوں سے واضح کروں گا۔میر انیسؔ کا ایک شعر ہے:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

دوسری جگہ لکھا ہے:

خواہاں تھے زیبِ گلشن زہراؑ جو آپ کے　　　شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

اگر اوس کی جگہ شبنم اور شبنم کی جگہ اوس کر دیا جائے تو بات غیر فصیح ہو جائے گی۔ یاد آ رہا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی نے کچھ ایسی ہی وضاحت کی ہے۔ پروفیسر امجد حسین صاحب نے نہایت دھیمے اور رسیلے لہجے میں اپنے نام کی غلطی کی نشان دہی کی ہے۔ شکریہ! اب امجد علی کی بجائے ہمیشہ امجد حسین ہی لکھا اور پڑھا جائے گا۔ پروفیسر فرحان نذیر نے بتایا کہ برخوردار رضوان نذیر شاگردِ خاص نے دو کتابت کی غلطیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ’’یادداشتوں‘‘ میں پہلی ’دال‘‘ نہیں لکھی گئی اور ’’زود کوب‘‘ کو ’’زدو کوب‘‘ لکھ دیا گیا ہے۔ پروفیسر نذیر حسین چودھری مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ نفسیات کی زبان میں ایسی خطاؤں کو (Reading illusions) کہتے ہیں۔ بہر حال برخوردار کی دِقّتِ نظری قابل قدر ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر خرم ورک کا جملہ عین حقیقت ہے کہ ’’غلطی رہ ہی جاتی ہے۔‘‘ یاد نہیں آ رہا، ایک ساتھی نے کہا: ’’آپ نے ’’حیرانی‘‘ لکھا ہے ’’حیرانگی‘‘ کیوں نہیں؟‘‘ میں نے کہا: ’’ایک شعر بہت پہلے ایامِ طالب علمی میں سُنا تھا:

نکالا ہم کو جنت سے فریبِ زندگی دے کر
دِیا پھر شوقِ جنت کیوں، یہ حیرانی نہیں جاتی

تب سے ایسا ہی لکھ رہا ہوں۔‘‘ باقی تفصیل ’’راہِ سخن‘‘ کے صفحہ نمبر 57 پر ملاحظہ فرما لیں۔ برخوردار احسان یوسف چیئرمین شیخوپورہ کالج نے اِس کتاب کی اشاعت میں خاطر خواہ معاونت فرمائی۔ اشاعت کے بعد کتاب اپنی کار میں لے کر گھر پہنچائی۔ ساتھ ہی سرورق کی پشت پر ’’ادب‘‘ کے بجائے ’’اب‘‘ سہواً کتابت ہے، بتایا۔ پروفیسر مراد صاحب نے بعض اغلاط کی نشان دہی کی ہے۔ مگر صفحہ 91 پر ’’حدود‘‘ کی آخری ’’د‘‘ چھوٹ جانا سُوئے اتفاق ہے۔ ’’دال‘‘ کی غلطی سے ایک لطیفہ یاد آیا۔ اُستاد بچے سے پوچھ رہا تھا کہ ان حروف میں ’’د‘‘ کون سی ہے تو بچے نے بے ساختہ کہا: ’’مسور کی دال۔‘‘ معلوم نہیں ضرب المثل ’’جوتیوں میں دال بٹنا‘‘ کا کیا پسِ منظر ہے؟

پروفیسر ڈاکٹر نوید احمد گل نے صفحہ نمبر 72 پر ’’مرغاں سحر‘‘ کو ’’مرغانِ سحر‘‘ کروایا۔ ساتھ گرامر کے رموز سے بھی آگاہ کیا کہ نقطہ اور زیر دونوں لازم ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا: ’’آپ کی جیب میں کالے رنگ

کی پنسل (مارکر) تو ہے ہی۔ابھی نقطہ لگا ئیں اور زیر بھی۔مسئلہ حل۔'' اُن کی نکتہ وری اور اسلوبِ بیاں دونوں ہی قابل داد ہیں۔شکریہ! پروفیسر میاں غلام رسول صاحب نے بتایا کہ سابق پرنسپل مقبول احمد تھے، مقبول حسین نہیں۔ساتھ ہی بتایا کہ آپ نے ''مگن'' کو ''مکن'' لکھ دیا ہے۔دقتِ نظری اور انہماک کا یہ عالم کہ دوستوں نے لفظوں سے لے کر ڈنڈوں تک سب کچھ دیکھ اور پڑھ لیا ہے۔
''مکن'' سے یاد آیا بہت دیر پہلے کوئی 1970ء کی دہائی میں مولانا روم کے دو اشعار پڑھے۔آپ کے ذوق کی نذر کرتا ہوں:

بر زمین مردماں خانہ مکن کارِ خود کُن کارِ بے گانہ مکن

ترجمہ: ''دوسروں کی زمین پر گھر تعمیر مت کر...... اپنا کام جار رکھ، بے گانہ کام انجام نہ دے''

کیست بیگاہ کہ تن خاکی تو از برائے اوست غم ناکی تو

ترجمہ: ''بیگانہ کون، تیرا خاکی (مادی) جسم جس کے لیے تُو پریشان وغم زدہ ہے۔مادیت کو چھوڑ، روحانیت کی جانب پلٹ۔''

دوستوں کے مشورے، آراء، تجاویز اور رہنمائی اِس امر کے غماز ہیں کہ احباب نے کتنی دقتِ نظری سے کتاب پڑھی ہے۔آج کے عدیم الفرصت عہد میں یہ امر بڑا خوش کُن اور حوصلہ افزا ہے۔ایسے احباب کے ہوتے ہوئے اِس عہد کو علمی خشک سالی کا عہد تو نہیں کہا جا سکتا۔کتابیں عہد بہ عہد لکھی جاتی رہی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی۔عدم فرصت اور کم خوانی کی شکایت بھی ساتھ ساتھ چلتی رہے گی۔کہیں پڑھا تھا کہ شوپن ہار کی کتاب ''کائنات بطور قوتِ ارادی اور تصوّر'' فلسفے کی شاہکار کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔مصنّف کا دعویٰ: ''یہ طبع زاد منضبط سلسلۂ فکر ہے۔صاف، سلیس اور قابل فہم عبارت میں لکھی ہے۔یہ ایک پُر تاثیر کتاب ہے جو حُسنِ بیان اور حُسنِ معانی سے لبریز ہے۔آگے چل کر دوسری کتب کے لیے خیالات کا مخزن اور سر چشمہ ہوگی۔'' لیکن ہُوا اُلٹ، کہ 16 سال بعد جب ناشر سے پوچھا تو اُس نے بتایا: ''بیشتر جلدیں ردّی کے بھاؤ فروخت کی جا چکی ہیں۔'' میں نے کتاب ناشر کو پوچھنے کی بجائے احباب میں تقسیم کر دی ہے۔کچھ تعلیمی درس گاہوں اور

لائبریریوں کو تحفہ میں دے دی ہیں۔ایک سال سے بھی کم عرصہ لگا۔احباب نے بھی سال سے پہلے پڑھ کر حق ادا کر دیا ہے۔اغلاط کی نشاندہی اور راہنمائی فرمانے کا شکریہ! اللہ پاک جزائے خیر دے۔عجب اتفاق ہے کہ صفحہ نمبر 43 کی پہلی سطر میں ''یادی'' کو''یادیں'' کرنے پر منصور احمد اعوان اور پروفیسر مراد علی صاحب کا اتفاق ہے باقی کسی غلطی پر احباب جمع نہیں ہوئے۔یہ تنوع اور رنگا رنگی کی نادر مثال ہے۔کتاب''راہِ سُخن'' پر احباب اہلِ نظر کے تبصرے''دادِ سخن'' کے نام سے پڑھیے اور اُن کے ذوقِ نظر اور جذبہ استحسان سے بہرہ ور ہوں۔شکریہ!

راہِ سُخن

پروفیسر نصیرؔ احمد کے نام

بڑھ کر مصاحبوں میں عجب کام کر گیا
لکھ کر کتاب ''راہِ سخن'' نام کر گیا

اُس کے شعورِ فکر میں ڈوبی ہے فکرِ نَو
ہم سے تو ہو سکا نہ جو وہ کام کر گیا

رس گھولتے مضامیں تنوع کے رنگ میں
تحریرِ دردِ شوق کی ہر گام کر گیا

خاکوں میں رنگِ خوں سے ہے جو بھی کھِلا ہوا
رنگیں نوا سے دل کے در و بام کر گیا

ڈالی کمندیں کیا کیا ہیں فکرِ جمیل کی
رقصِ دمِ حیات میں ہر شام کر گیا

کرتے ہیں زندگی کا سفر طے سبھی ، مگر
پتھر پہ دیکھ کندہ ، مِرا نام کر گیا

جذبے دیے تھے جو بھی رازِ حیات میں
کھُل کر نصیرؔ بات وہی عام کر گیا

دوشعری مجموعوں ''انخلا'' اور ''رابطہ'' کے خالق جناب امجد جاوید صدر معلم (ر) گورنمنٹ H/S چک نمبر 10 کے قلم سے، جن سے 56 برس پرانا تعلق ہے۔ (مصنف)

خراجِ تحسین بحضور پروفیسر نصیر احمد

وہ شہرِ بے ہُنر میں ، ہُنر کی مثال ہے
دشتِ بلائے جاں میں شجر کی مثال ہے
وہ اِک گھنے درخت کی صورت ہے دھوپ میں
سائے کے اعتبار سے گھر کی مثال ہے
روشن کیا ہے اُس نے دماغوں کو فکر سے
سورج سرشت ہے وہ قمر کی مثال ہے
شبنم کی طرح نرم و لطیف اُس کا ہے مزاج
اہلِ نظر میں دیدۂ تر کی مثال ہے
اُس نے بہت جلائے ہیں تعلیم کے چراغ
وہ شب کی تیرگی میں سحر کی مثال ہے
بھرتا ہے موتیوں سے وہ کشکول ذہن کے
جو قول بھی ہے اُس کا گُہر کی مثال ہے
خوشبو ہے اُس کی رات کے اندر بسی ہوئی
بزمِ حیات میں وہ ''عطر'' کی مثال ہے
ایماں کی روشنی سے منوّر ہے اُس کا دل
وہ چشمِ حق نگر میں ، نظر کی مثال ہے

امجد جاوید

غالبؔ نے مومنؔ کی وفات پر کہا تھا کہ چالیس بیالیس سال پرانا تعلق تھا۔ اِتنا پرانا تو دُشمن نہیں ملتا، دوست کہاں سے ہاتھ آئے گا۔ (مصنف)

اکادمی ادبیات پاکستان

قومی ورثہ وثقافت ڈویژن

حکومت پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف
صدرنشین

حوالہ نمبر ا(۲)۲۰۲۳ء مورخہ۔ ۲۳ جنوری ۲۰۲۴

محترم نصیر احمد چوہدری!
السّلامُ علیکم!

آپ کی طرف سے ارسال کردہ کتاب راہِ سخن کے دو نسخے موصول ہوئے میں اس کرم فرمائی کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ یہ کتاب بے حد دلچسپ یادداشتوں کے بیان پر مبنی ہے جس میں نئی نسل کے لیے تربیت وارتقا کے کئی مواقع پنہاں ہیں۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

یادآوری کے لیے شکرگزار ہوں۔ احترامات کے ساتھ

والسّلام

پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف

= محترم نصیر احمد چوہدری کی خدمت میں بصد آداب

بِاِسمِہٖ تعالیٰ

محترم ومکرم ومعظم جناب پروفیسر نصیر احمد چودھری صاحب!

السلامُ علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ۔اُمید ہے جناب بخیریت ہوں گے۔

''راہِ سخن'' (یادداشتیں اور مضامین) آپ کی تصنیفِ لطیف پڑھی۔آپ بیتی کے ساتھ ساتھ اُس وقت کی ثقافت،نصف صدی قبل کو بہت خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری اپنے ماضی میں کھو جاتا ہے۔کتاب اسلامی بھی ہے،مزاح سے بھرپور،آپ بیتی بھی ہے جگ بیتی بھی ہے میں نے اب تک ہزاروں کتابیں پڑھی ہیں اور پھر نئی .... مگر آپ کی ساری کتاب پڑھ کر دوبارہ روزانہ کوئی نہ کوئی مضمون،کہانی،یادداشت پڑھ کر تازہ دم ہو جاتا ہوں۔آپ کی تحریر بعنوان ''مروّت کی تصویر .... ڈاکٹر لُبنیٰ نصیر'' مرحومہ نے بہت رلایا۔پھر بعنوان ''والدین'' نے۔1947ء کے مہاجرین کے قافلوں کی ہجرت اور لُٹے پٹے پاکستان پہنچنا،نے بہت کچھ یاد کروادیا۔پھر ''واہ،پروفیسر عباد علی واہ''......ولی کامل کے خیال کا تصرف......بہت خوب............ بیت اللہ میں احباب کے لیے دُعائیں .... زبردست۔

معذرت کے ساتھ چند ایک پروف ریڈنگ کی اغلاط کی درستی لکھ رہا ہوں۔اگر کبھی ممکن ہو تو نئے ایڈیشن میں ترمیم کر لیجیے گا۔شکریہ!

والسّلام

عاجز۔دُعاگو

منصور احمد اعوان

۱۵۔رمضان المبارک ۱۴۴۵ ہجری

26۔مارچ،2024ء

نوٹ:منصور احمد اعوان سے اب تو قلمی اور موبائل کے ذریعے دوستی ہے۔اُنھوں نے نوائے وقت کے تبصرہ کے بعد کتاب ''راہِ سخن'' طلب کی۔مطالعہ کے بعد اس پر اظہارِ خیال کیا۔حوصلہ بڑھایا۔شکریہ!(مصنّف)

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور (سنڈے میگزین)

راہِ سخن

راہِ سخن یادداشتوں اور مضامین سے مزین ایک خوب صورت اور خوب سیرت مجموعہ ہے۔ اِس خوب صورت کتاب کے مصنّف نصیر احمد چودھری ہیں۔ پروفیسر نصیر احمد چودھری گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج شیخوپورہ میں اُردو کے مایہ ناز اُستاد کے طور پر اپنے فرائض انجام دیتے رہے اور پھر اسی کالج سے احترام و وقار کے ساتھ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ کالج میں پروفیسر نصیر احمد چودھری کا علم و ادب اور درس و تدریس کے حوالے سے طوطی بولتا تھا۔ طالب علم نہ صرف کلاس میں ان کے لیکچر سے مستفید ہوتے بلکہ کلاس کے بعد بھی ان کے علم کے خزینے سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی فکر میں رہتے۔ کلاس میں چونکہ فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر یا گریجوایشن کے طلباء کی ذہنی سطح اِتنی بلند نہیں ہوتی اِس لیے انھیں پروفیسر نصیر احمد چودھری اُن کی ذہنی سطح کے مطابق پڑھاتے اور خوب پڑھاتے۔ دوسری طرف ان کی کتاب ''راہِ سخن'' دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ''مثنوی سحرالبیان'' کا سا سحر قاری پر طاری ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کو اُردو زبان کے ارتقا میں عربی و فارسی زبانوں کے عمل دخل کا ثبوت فراہم کرنے کے بارے میں کہا جائے تو یہ پروفیسر نصیر احمد چودھری کی کتاب پڑھنے کو دی جائے تو وہ شخص پکار اُٹھے گا کہ عربی اور فارسی زبانوں نے اُردو زبان کو ثروت مند بنایا ہے۔ پھر پروفیسر صاحب کی تحریر میں تکلف اور پیچیدگی کا احساس نہیں ہوتا، ڈھلی ڈھلائی تراکیب اور وفورِ آمد سے بنے بنے جملے غیب کے سے مضامین کی طرح صفحۂ قرطاس کی زینت بنتے چلے جاتے ہیں اور قاری کی روح کو سیراب کرتے ہوئے خوش وقت کرتے چلے جاتے ہیں۔ پروفیسر نصیر احمد چودھری نے دوست احباب اور اپنے ہم عصروں اور ہم چشموں کے خاکے کیا لکھے ہیں، جیتی جاگتی تصویریں کھینچ دی ہیں۔ عظیم محقق حافظ محمود شیرانی کے پوتے اور رومانی شاعر اختر شیرانی کے بیٹے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی اُردو ادب کی آبرو تھے اور شیخوپورہ کی بھی۔

اُن کا خاکہ چودھری نصیر نے اِتنا خوب صورت لکھا ہے کہ اُن کی شخصیت چلتی پھرتی اور ہنستی بولتی محسوس ہوتی ہے۔ڈاکٹر سید معین الرّحمٰن (مرحوم و مغفور) کا تذکرہ بھی زیرِ نظر کتاب میں ملتا ہے۔ اُن کے بارے میں پروفیسر نصیر احمد چودھری لکھتے ہیں:''اعلیٰ ظرف، نفیس، ذہین و فطین، مروّت اور تہذیبِ نفس کا پیکر تھے۔'' غلام رسول آزاد (پرنسپل)، پروفیسر مراد علی، عبداللطیف مغل (پرنسپل)، پروفیسر محمد رفیق مرزا، پروفیسر محمد اکرم ڈوگر، لالہ اکرم سعید اور بہت سے دوستوں کے خاکے اور مضامین اِس کتاب میں دِکھائی دیتے ہیں۔اس کتاب کو ہر لائبریری کی زینت بننا چاہیے۔ناشر: مکان نمبر 67، گلی نمبر 3، محلّہ مجاہد نگر، وارث روڈ شیخوپورہ۔
فون:0333-5002319

چند سخن اور

ایک تھا بادشاہ

داستان قدیم صنفِ سُخن ہے ۔ یہ صنف پریشان دلوں کی ڈھارس بندھاتی ہے ۔انسان اِس میں کھو کر سو جاتا ہے اور دکھ بھول جاتا ہے ۔''کاغذ کی کشتی اور بارش کا پانی ،لوٹا دو مجھ کو میری جوانی''سب کی یکساں خواہش ہے ۔ہمارے بچپن میں''ماسی مُنّی''اور لڑکپن میں ماموں''پھتّا ''فتح محمد جب بطور مہمان آتے تھے تو بچوں میں خوشی کی لہر دَوڑ جاتی تھی ۔ایک دوسرے کو بتاتے پھرتے تھے کہ آج پھر کہانی سُنیں گے ۔وہ کہانی سناتے جاتے تھے اور بچے باری باری ماؤں کی گودیوں میں لپٹ کر گہری راحت بھری نیند کے مزے لینے لگتے ۔دوسرے دن پھر وہی اشتیاق !ہر کہانی قوتِ متخیّلہ کو مہمیز کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے دامن میں اخلاقی سبق لیے ہوتی ہے ۔اس کی اثر پذیری جسم و روح میں سرایت کر جاتی ہے ۔اور انسان کی اخلاقی تربیت کا باعث بنتی ہے ۔

آؤ سُنو کہانی ۔کہتے ہیں کسی زمانے میں ایک بادشاہ کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا ۔زر و مال ،جاہ وحشمت ،اقتدار و اختیار ،تاج وتخت ،لشکر وسپاہ ،فرماں بردار رعایا ،باتدبیر وزراء ،ملک فراخ ۔کسی چیز کی کوئی کمی نہ تھی ۔ ہاں !البتہ بادشاہ کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی ۔ بادشاہ کو ایک ہی فکر ستائے جاتی تھی کہ تخت وتاج کا کوئی وارث نہیں ۔ ہر طرح کی تدبیر کی مگر بے سود ۔''تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ'' ۔اِسی کشمکش میں شب و روز گزرتے رہے ۔ایک دن کسی اہلِ دل یا صاحبِ نظر کا دربار میں آنا ہوا ۔بادشاہ نے اپنا دکھڑا سنایا ۔اُس نے معاملہ غور سے سُنا اور تجویز دی کہ بادشاہ سلامت !ایک بڑا حوض تعمیر کروایا جائے اُسے رات بھر دودھ سے بھرنے دیا جائے ۔تاروں کی

چھاؤں میں ملکہ اس حوض میں دودھوں نہائے ۔اللہ پاک نرینہ اولاد کی نعمت سے نواز دے گا اور تخت کا وارث میسّر آئے گا۔ بادشاہ کو تجویز پسند آئی ۔اہلِ دربار نے ہاں سے ہاں ملائی ۔ایک بڑا حوض چند روز میں سنگِ سرخ سے تعمیر ہوگیا۔اب حوض کو دودھ سے بھرنے کا مرحلہ تھا۔ پورے شہر اور مضافات میں اعلان ہوا کہ حوض کو دودھ سے بھرنے کا حکم ہوا ہے۔کسی طرح کی کوتاہی قابل قبول نہیں ہوگی ۔۔عوام تعمیل کے لیے باہر نکلے ۔رات بھر حوض بھرا جاتا رہا۔ ہر کسی نے اپنا اپنا حصہ ڈالا۔کوئی دوکلو کا برتن لیے اور کوئی پانچ کلو لیے حوض کی جانب رواں دواں تھا۔رات بھر لوگ جاگتے رہے، راستے آباد تھے ۔صبح صادق سے قبل حوض بھرا جا چکا تھا۔وقتِ مقررہ پر تاروں کی چھاؤں میں صبح صادق سے قبل ملکہ خواصوں کے ساتھ جب حوض پر پہنچی تو حیرت کی انتہا نہ رہی کہ حوض لبا لب بھرا ہوا ہے مگر اِس میں دودھ کی بوند تک نہ تھی ۔ پانی ہی پانی چھلک رہا تھا۔ ہر ایک نے سوچا کہ میں پانی ڈال آتا ہوں دوسرا دودھ ڈال جائے گا۔اب بات سمجھ آئی کہ جب بددیانتی کی سوچ میں اِس قدر یکسانیت ہو،قلیل تعداد بھی ایمان کے جوہر سے تہی دست ہو جائے، جب اقدار رخصت ہو جائیں تو تخت کے وارث پیدا نہیں ہوا کرتے ۔فطرت کا اصول ہے کہ جب کوئی قوم اللہ کا راستہ چھوڑ کر باطل کا راستہ اختیار کرتی ہے تو اللہ پاک اس کی جگہ کسی اور قوم کا انتخاب کر لیتا ہے ۔ یہ تاریخ کا فلسفہ بھی ہے ۔

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اللہ پاک کی تقسیم کا انداز اپنا ہے جب چاہے، جسے چاہے، جیسے چاہے عطا کر دے، جب چاہے روک لے ۔

ایک دفعہ جمعہ کا روز شیخوپورہ کی مسجد عید گاہ میں نمازِ جمعہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔قاری امین بڑے خوش الحان تھے ۔جب تلاوت کرتے تھے وجد کا عالم اور مستی کی کیفیت طاری کر دیتے تھے ۔اُس روز بڑا دل چسپ واقعہ سُنایا۔فرمایا:’’میں دارالعلوم دیوبند میں پڑھتا تھا۔رمضان کے مہینے میں گھر آیا ہوا تھا۔عید الفطر میں ابھی چند روز باقی تھے ۔میں اور میرے چچا میری پھوپھی

اور اُن کی بہن کو عید دینے کے لیے اپنے گاؤں سے قریبی تیسرے گاؤں کی طرف پیدل جا رہے تھے۔ راستے کے ایک گاؤں میں گاؤں کے باہر راستے کے ساتھ ایک تنور تھا۔ پرانا، بوسیدہ، شکستہ۔ سوراخ بڑے ہو چکے تھے۔ وہاں چند بچے (سات سات، چھ چھ سال عمر کے) کھیل رہے تھے۔ وہ باری باری تنور کے اوپر سے سوراخ سے داخل ہوتے اور نچلے سوراخ سے باہر نکل آتے تھے۔ چچا جان تھوڑی دیر کھڑے وہاں دیکھتے رہے۔ چچا جان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہی جانے جس کے نہیں ہوتی۔ خاندانی منصوبہ بندی والے کیا جانیں؟ خیر چچا جان کے منہ سے بے اختیار یہ جملے ادا ہوئے: ''جن کو دیتا ہے اُن کے تنوروں سے بھی نکل آتے ہیں۔'' قبولیت کا وقت تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ میں ماہِ رمضان کے بعد دارالعلوم دیوبند چلا گیا۔ جب دوسری عید کے موقع سے پہلے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ چچا جان کو اللہ پاک نے بیٹے کی نعمت سے نواز دیا ہے۔''

اُس کے معاملے وہی جانے۔ یہ رنگ رنگ جلوے اُس بے رنگ کے جلوے ہیں۔

نہیں تیرے سوا یہاں کوئی — میزباں تو ہے میہماں تو ہے
رنگ تیرا چمن میں، بُو تیری — خوب دیکھا تو باغباں تو ہے

حیرت خانۂ عالم

کائناتِ ہستی کی ابتدا اور انتہا نامعلوم ہے۔ ان دونوں نامعلوم اور پُر اسرا انتہاؤں کے درمیان انسانی تجربے کی دنیا واقع ہے۔ انسانوں کی اِس بستی میں ہر طرح کا خیر و شر موجود ہے۔ خیر کے چاہنے والوں کو چارسو خیر ہی خیر نظر آتا ہے جبکہ شر کے متوالوں کو ہر انسان شریر اور غیر مہذّب دِکھائی دیتا ہے۔ ہماری تاریخ بڑی تاب ناک ہے۔ زمانے کو قدروں کی روشنی میں دیکھنے کا نام تاریخ ہے۔ اب مگر ہے کہ اقدار کی پاسداری کم ہوتی جارہی ہے۔ مادی خواہشات کے غلبہ نے اقدار کو پس پُشت ڈال دیا ہے۔ قناعت جاتی رہی۔ حسرت بڑھتی چلی گئی۔ لیکن خوئے وفا ظاہر کرنے کے لیے تین واقعات کا ذکر بہت دل چسپ رہے گا۔ آؤ سُنیں!

مولانا طارق جمیل (جن کے تقویٰ اور تقریر کا شہرہ ہے۔ تقریر کی تاثیر سے بھی سب واقف ہیں۔ دعاؤں کا گداز اپنی جگہ) اُن کا بیٹا واصل بحق ہوگیا۔ وہ خدا ترس بیٹا اپنے گاؤں کے ایک مجذوب کی خاطر داری کرتا تھا۔ لتھڑے کپڑے اُتار کر نئے کپڑے پہنا تا رہا۔ ٹپکتی رال اُس کے لیے نفرت کا باعث نہ تھی۔ محبت کا یہ سفر جاری تھا۔ اُس خدا ترس بیٹے کی وفات کے بعد دو تین دن تک یہ خبر آتی رہی کہ مذکورہ بالا مجذوب اس کی قبر پر مسلسل بیٹھا رہتا ہے۔ سنگ چھوڑنے کا نام نہیں لیتا۔

مجھے یاد آیا شیرانی صاحب نے اپنی کتاب ''بے نشانوں کا نشان'' میں چک نمبر 17 کے شریف کے بارے میں لکھا ہے کہ کئی کُتے اُس کی حویلی میں بسیرا کیے رہتے تھے۔ وہ بلا ناغہ دو وقت اُن کو روٹی کے ٹکڑے ڈال دیتا۔ اُس کی موت کے بعد جب میّت قبرستان کی طرف لے جارہے تھے، انسانوں کے جھرمٹ میں ایک کتیا بھی ساتھ ساتھ تھی۔ دفن کرنے کے بعد لوگ لوٹ آئے مگر کُتیا قبر پر ہی بیٹھی رہی۔ دوسرے دن لوگ پکڑ کر لائے لیکن وہ پھر قبرستان پہنچی۔ آخر اُسے باندھ

دیا گیا کہ کہیں بھوکوں نہ مر جائے۔

ہمارے ایک ساتھی پروفیسر مراد صاحب بتاتے ہیں کہ اُن کے والد صاحب روزانہ چڑیوں کو دانہ ڈالتے تھے۔ وقتِ مقررہ پر روزانہ چڑیاں وہاں جمع ہو جاتی تھیں۔ جس دن والد صاحب جہانِ فانی سے عالم بقا کو سدھارے تو اُس روز معمول کے مطابق چھوٹے بھائی نے چڑیوں کو دانہ ڈالا۔ مگر کسی چڑیا نے دانے کو منہ نہیں لگایا۔ سب چڑیاں دانہ چگے بغیر اُڑ گئیں۔ چاول اور دال ملی ادھر ہی پڑی رہ گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ پرندوں، حیوانوں اور دیوانوں میں کون سی خرد افروزی ہے کہ جس نے اُنھیں یکساں طور پر وفاداری کا درس دیا تھا۔

انسانوں کی وفاداری کے قصوں سے کُتب بھری پڑی ہیں۔ بھری محافل و مجالس میں بھی اس کے تذکرے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں کسی جگہ چار پروفیسر صاحبان جمع تھے۔ چاروں اپنی اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو کر پنشن پر زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ تین پروفیسر صاحبان تو لاہور کی نامور درس گاہوں سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ایک دور کے کسی نارنگ جیسے کالج سے ریٹائر ہوئے تھے۔ گفتگو کے دوران میں تینوں پروفیسر صاحبان اپنے اپنے مایہ ناز شاگردوں کے احسان شناسی کے واقعات سُنا سُنا کر خوش ہوتے جا رہے تھے۔ چوتھا پروفیسر خاموش تسلی سے اُن کی گفتگو سُنے جا رہا تھا۔ اُنھوں نے کہا: ”جناب آپ بھی کچھ کہیے؟“ اُس نے کہا: ”یار! رہنے دیجئے۔“ جب سب نے اصرار کیا تو اُس نے کہا: ”ایک دفعہ میں رات کے وقت گھر آ رہا تھا۔ راستے میں ناکا (ناکہ) لگا ہوا تھا۔ بہت سی ٹریفک رکی ہوئی تھی۔ چھوٹی بڑی گاڑیوں کی تلاشی جاری تھی۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ جب وہ نقاب پوش ہماری گاڑی کے قریب آئے تو ایک سردار نما نقاب پوش نے مجھے سیلوٹ کیا اور ہماری گاڑی کو جانے دیا۔ بلکہ باقیوں کو بھی روانہ کر دیا۔ واقعہ سُن کر باقی پروفیسر حیران رہ گئے۔ احترامِ اُستاد بیک بنچر (Back Benchers) میں زیادہ دیکھنے میں آتا ہے۔ ایک دفعہ 1997ء کا واقعہ ہے۔ میں نے ایک عدد موٹر سائیکل ہُنڈا 70 گولڈن جوبلی خریدی۔ بچیوں کو کالج لانے لے جانے کے لیے خریدی تھی۔ 47 سال کی عمر میں ڈرائیوری سیکھی۔ پختہ کاری

بالکل نہ آئی۔میں اکثر اُن راہوں پہ جاتا تھا جن میں زیادہ رش نہ ہو۔ابھی موٹر سائیکل خریدے کوئی زیادہ وقت بھی نہ گزرا تھا۔ایک راستے سے گزر رہا تھا کہ دو لڑکے راستے میں تھے۔ایک مسلّح دوسرا خالی ہاتھ اُسے گائیڈ کر رہا تھا۔تیز تیز قدموں کے ساتھ میری طرف بڑھے آرہے تھے۔میں نے سوچا موٹر سائیکل تو گئی۔زیادہ تیز چلانا میرے بس میں نہیں۔پیچھے مڑنا عاقبت نااندیشی ہے۔اسی شش و پنج میں تھا۔ایک لڑکا میرے پاس کھیت میں کچھ دوری پر تھا۔اُس نے مجھے پہچان لیا اور سیلوٹ کیا اور دوسرے کو بندوق چھپانے کا اشارہ کر رہا تھا۔آخر چھبیس سال بعد خستہ حالت میں وہ موٹر سائیکل گھر کے دروازے سے باہر اُٹھا لی گئی۔ایک شاگردِ رشید جو S.H.O ہے نے FIR درج کروائی اور مجھے کہا کہ اس کی قیمت لے لو۔میں نے کہا: ''اگر سب کو دیتے ہو تو لیتا ہوں۔'' وہ مسکرا دیے اور میں گھر کو لوٹ آیا۔یہ تھا قصہ۔۔

علامہ اقبالؒ وطن سے محبت کرتے ہیں جبکہ نظریہ وطنیت سے نفرت۔وطن عزیز ہماری اُمنگوں اور ہماری امیدوں کا محور ہے۔مرکزِ یقین شاد باد۔ہماری دعا ہے،لیکن جب میں بازار و باغ میں گھومتا ہوں تو مجھے بہت سے طلباء و طالبات سرِ راہ ملتے ہیں۔طلباء میں سے اکثر بتاتے ہیں سر میں جرمنی میں ہوتا ہوں۔سر مجھے انگلستان میں عرصہ ہو گیا ہے۔سر! میں اِٹلی میں مقیم ہوں۔ بعض پرانے شاگرد بتاتے ہیں کہ سر! میں نے اپنے تین بیٹوں کو یو۔کے کا ویزا لے دیا ہے۔ صرف 75، 75 لاکھ میں۔کچھ کینیڈا،سویڈن اور بعض امریکہ اور یو۔اے۔ای کی بات کرتے ہیں۔بہت سے عزیز و اقارب تو پہلے سعودی عرب کے مختلف شہروں میں بسیرا کیے ہوئے ہیں۔سرِ راہ ایک طالب علم نے بتایا کہ میں جلد امریکہ جا رہا ہوں۔میں نے کہا: ''خرچہ کتنا! کہنے لگا: ''ایک کروڑ تقریباً۔میں نے کہا: ''بس!'' اُس نے کہا: ''جی!'' مجھے معلوم نہیں کیوں احساس ہوا کہ جن سے آزادی حاصل کی تھی اب وہاں لاکھوں لگا کر جا رہے ہیں۔ملک کا اعلیٰ برین (Brain) دیارِ غیر کی راہ لے رہا ہے۔کیوں نہ اپنی اداؤں پر ذرا غور کریں۔ہم عرض کریں گے تو شکایت ہو گی۔آؤ بنائیں اپنا پاکستان۔قائدِ اعظم کا پاکستان۔شاعرِ مشرق،حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ کے خوابوں کا

پاکستان، لاکھوں شہیدوں کے ارمانوں کا پاکستان۔ پاک باطن نوجوانوں کا پاکستان! یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی۔ محنت، لگن، اپنی مدد آپ اور اخلاص و عمل کی ضرورت ہے۔ سادہ چلن اور بے تکلف زندگی: اور

تمنا آبرو کی ہے اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

ہمارے پڑوس میں ایک اُردو بولنے والا خاندان آباد ہوا تھا۔ راجپوت خاندان۔ بعض راؤ کہلاتے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد ایک مخلوط طرز کی تہذیب وجود میں آئی۔ پنجابی بولنے والوں کی رشتہ داریاں اُردو بولنے والوں سے ہونے لگیں۔ اسی طرح اس خاندان کی بیٹی کی نسبت پنجابی بولنے والے خاندان سے ٹبہ سُلطان میں طے پا گئی۔ دونوں خاندانوں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا ہو گیا۔ لڑکے کے ایک ماموں منیر احمد نام تھا، قریبی گاؤں میں رہتے تھے۔ وہ ایک دفعہ شاید پہلی مرتبہ اُن سے ملنے آئے تو بیٹی زبیدہ نے پوچھا: ''ماموں! چائے بناؤں؟'' اُس نے کہا: ''نہیں! کوئی ضرورت نہیں۔'' اُس نے کہا: ''کیوں؟'' جواب ملا: بیٹا! ''میں تے اجے پرسوں ای پیتی سی۔'' (یعنی میں نے ابھی پرسوں ہی پی تھی) مجھے چائے پیئے ابھی تیسرا دن ہے۔ زیرِلب مسکراہٹ۔ ضبط ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔ اُس عہد میں چائے یا تو حکیم کے مشورے سے یا بیماری کے ایام میں استعمال کرتے تھے۔ عام طور پر یہ بات سُنی گئی:

اِک گھُٹ دُدھ دا، پتیلا پانی دا۔۔۔۔ پے گیا رواج خصماں نوں کھانی دا

عام سی باتیں بھی اپنے اندر حکمت اور سرور لیے ہوتی ہیں۔ ایک دفعہ سردیوں کا موسم، غالباً دسمبر کا مہینہ! چھٹی کا روز تھا۔ میں گھر میں چُھٹی کے مزے لے رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ نیچے آیا۔ دیکھا تو شعبہ سیاسیات کے دو پروفیسر چودھری اظہر اور میاں غلام رسول) دروازے پر موجود تھے۔ بہت خوشی ہوئی۔ معمول کی تواضع کے بعد چودھری اظہر نے فرمایا: ''یار! آپ سے ایک مختصر سی الوداعی تقریر لکھوانے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ میں نے عرض کیا:

''تقریر لکھنے کے لیے تو فرصت اور فراغت کے علاوہ یکسوئی درکار ہوتی ہے۔ اُنھوں نے کہا: ''ہم باہر دھوپ میں کھڑے ہوتے ہیں۔ آپ تقریر لکھیں۔'' اُن کا حُسنِ ظن تھا۔ میں انکار کیسے کرتا۔ عُنوان بھی نہایت سادہ، روایتی اور دلچسپ تھا۔ ڈپٹی کمشنر (شفقت نغمی) کی خدمات۔ خیر وہ باہر کھڑے ہو گئے۔ دھوپ سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ میں تقریر لکھتا رہا۔ خدا کی قدرت کوئی آدھ پون گھنٹہ میں تقریر تیار ہوگئی۔ متن تو اُن کا تھا اور الفاظ فکرِ نارسا کے۔ تقریر اُنھیں دِکھائی، اُنھیں حسبِ ذوق پسند بھی آئی۔ وہ رخصت ہوئے اور میں فارغ۔ جب نمازِ ظہر سے پہلے میں باہر نکلا تو ایک دو صاحب باہر کھڑے تھے۔ کہنے لگے: ''نصیر صاحب! آپ نے آج صبح دو پروفیسر دھوپ میں کھڑے رکھے۔ کیا معاملہ تھا؟'' میں نے کہا: ''یہ سب کچھ اُن کی مرضی سے ہوا ہے۔ اُنھوں نے تقریر لکھوانا تھی اور مجھے تنہائی اور یکسوئی کی ضرورت تھی۔'' اُن میں سے ایک نے کہا: ''وہ تو پروفیسر تھے۔ کہاں کے پڑھے ہوئے ہیں؟'' میں نے کہا: ''میاں اظہر راوین ہے اور میاں صاحب نامور منسراجین ہیں۔ خوب پڑھے لکھے اساتذہ ہیں۔'' اُس نے کہا ''وہ آپ سے تقریر لکھوانے آئے! آپ کہاں کے پڑھے ہوئے ہیں؟'' میں نے کہا: ''جناب! میں کمپنی باغبین (Baghian) ہوں۔ اعتماد کا رِشتہ ہے۔ اُنھوں نے مجھ پر بھروسا کیا، میں نے اُن کا مان رکھ لیا۔ زندگی ایسے ہی اعتماد و اعتبار سے چلتی ہے۔ اِس میں بڑے چھوٹے کی تفریق کرنے سے چلن کا پہیہ رک جاتا ہے۔ امتیازات اُٹھ جائیں تو حجابات بھی دور ہو جاتے ہیں۔ اِس ملک میں امتیازات ہی امیتازات ہیں اور حجابات بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ دیکھو کیا رنگ لاتی ہے ہماری فاقہ مستی ایک دن۔ ہم نے نہ بھی دیکھا تو زمانہ دیکھے گا۔ ہماری عبادات خصوصاً نماز باجماعت کا مقصد ہی ہر طرح کے مقام و مرتبہ اور نسلی امتیاز کی نفی ہے۔ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔ قرآن مجید کے ہاں نسل و قوم اور شعوب و قبائل کی تقسیم تعارف کے لیے ہے امتیاز کے لیے نہیں۔

''تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے'' والا معاملہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

گردے کی کہانی

اللہ پاک کی کائنات اور کتاب میں کیا کیا کچھ دیکھنے، سُننے اور پڑھنے کو نہیں؟ عقل بے بس، فکر نارسا اور مشاہدہ محدود اور تجزیہ ناممکن ہے۔ اُس کے راز وہی جانے۔ اگر کچھ اسرار وا ہو جائیں تو صرف اُس کی توفیق سے۔ 1992ء کا واقعہ ہے، اوائل سردیوں کا موسم، میری اہلیہ کو دردِ گردہ کا عارضہ لاحق ہوا۔ حسبِ توفیق علاج معالجہ کیا۔ مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ پروفیسر زاہد جو میو ہسپتال کی گُردہ وارڈ میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے، اُن کے کلینک میں دکھایا۔ الٹرا ساؤنڈ کے مراحل طے پائے۔ اُنھوں نے گُردہ نکالنے کا مشورہ دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر پرائیویٹ نہیں تو سرکاری طور پر میو ہسپتال میں بھی آپریشن ممکن ہے۔ بہر حال اُن کی دل دہی کا شکریہ۔ بچے کم عمر، روپے پیسے کی بھی کوئی ریل پیل نہ تھی لیکن بھرم قائم تھا۔ میں نے شوخیِ طبع میں ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیا کہ ڈاکٹر صاحب 35 سال ایک گردے پر اور اگلے 35 سال دوسرے گردے پر۔ بات ہنسی مذاق میں آئی گئی ہوئی۔ ڈاکٹر ارشد مرزا سے مشاورت کی۔ دم بھی کیا۔ مراد بر آئی۔ درد جاتا رہا۔ معمولات کے شب و روز لوٹ آئے۔ 18 سال بعد پھر وہی بیماری عود کر آئی۔ اب بیٹی ڈاکٹر، بیٹا پروفیسر، وکیل اور ایک بیٹی ٹیچر دیگر دو بچے بیٹی اور بیٹا زیرِ تعلیم۔ اب مشاورت اور علاج کے معاملات تو میرے ہاتھ سے منتقل ہو چکے تھے۔ ہاں تبرکاً مجھ سے پوچھ گچھ لیتے تھے۔ رپورٹس ہوئیں۔ علاج ہوتا رہا، مگر شفا نایاب۔ میرے ایک داماد نے میری اجازت سے پھر ڈاکٹر زاہد صاحب سے مشورہ کیا۔ اُنھوں نے گُردہ نکالنے کا مشورہ دیا۔ میں نے کہا: ''کسی سے دوسری رائے بھی لے لینی چاہیے۔ بیٹی نے اپنے سُسر کے ہم جماعت ڈاکٹر .... سروسز ہسپتال کے گردہ وارڈ کے ہیڈ سے مشاورت کی اور اُنھوں نے داخل کروا دیا۔ اسی گردے سے ڈیڑھ لیٹر پیپ بھی نکال دی گئی۔ راحت میسر آئی۔ اگلے مراحل کی تیاری میں کئی دن لگ گئے۔

انمول سے ایک ٹیسٹ کروانا تھا۔میں بھی ساتھ گیا۔خالد گجر ٹیسٹ آپریٹر تھا۔اُس نے مجھے کہا: ’’جناب گُردہ مت نکلوائیے۔میری رائے یہی ہے۔‘‘مگر ڈاکٹر تو گُردہ نکالنے پر مُصر تھے۔اب تاریخ مقرر ہوئی کہ فلاں دن گُردہ نکالنا ہے۔بے ہوشی کا عمل طے پا گیا۔ڈاکٹروں کی ٹیم گردے کے آپریشن کے لیے جمع تھی۔جب آخری ویو(عکس بندی) کی گئی تو اُنھوں نے کہا:’’گردہ نکالنا ممکن نہیں۔صرف گُردے کی نالی بدلنا مقصود ہے۔ایسے آپریشن ممکن نہ ہوا۔بلکہ اگلی تاریخ تک ملتوی کر دیا گیا۔ایسے نالی تبدیل کی گئی اور دوائی کے استعمال کے بعد صحت پھر بحال ہوگئی۔اب تیرہ سال بعد پھر وہی مرض عود کر آیا ہے۔طرح طرح کے خوف اور تجاویز زیرِغور ہیں۔دونوں بہویں ڈاکٹر اپنا فارمولا استعمال کر چکی ہیں۔پہلے پروفیسران سے بھی مشاورت ہو چکی ہے۔فارماسسٹ بیٹی اور فارماسسٹ بہو بھی دوائی آزما چکی ہے۔ہر کوئی حصہ بقدرِ جُثہ ڈال چکا ہے۔

اب بھی کئی ماہرین اِمراضِ گُردہ کو چھوٹا ڈاکٹر بیٹا دکھا چکا ہے۔آپریشن کی مشاورت اور تیاری کی منصوبہ بندی ہے۔

قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے؟

☆☆☆☆☆☆☆

الیکشن

الیکشن کی صدائیں اِس قدر سُنائی دی ہیں کہ تکرار سے بیزاری سی ہونے لگی ہے۔
2024ء کے الیکشن پر متعدد داہلِ سیاست کا اجماع ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں؟ سب جانتے ہیں۔ ہر کس وناکس کو فارم 45 اور 47 کا نام یاد ہو گیا ہے۔ بعض تو فارم 49 سے بھی واقف ہو گئے ہیں۔ یہ میڈیا کی خبر گیری کا عہد ہے یا انٹرنیٹ کی شہرت کا زمانہ یا سوشل میڈیا کی آگہی یا گمراہی کیا کہیے: ایک دن ریاضی کے دو پروفیسران فارم 45 اور 47 کی بات کرتے کرتے کہہ رہے تھے کہ شاید فارم نمبر 47 فارم نمبر 45 کے بغیر تیار کر دیے گئے ہیں۔ میں نے کہا: ''یار عجب بات کرتے ہو۔'' بعض بچے جن کو ریاضی سے دل چسپی نہیں ہوتی تھی، اساتذہ بھی اُن کو سمجھانے سے قاصر رہتے تھے۔ وہ سوالات کے جوابات رٹ لیتے تھے اور امتحان میں درست جواب لکھ کر آجاتے تھے۔ بعض کی یہ تدبیر کارگر بھی ہو جاتی تھی۔ بعض اپنے ناکام ہونے پر والدین سے کہتے تھے کہ مجھے تو تمام جواب اب تک یاد ہیں۔ ایسے الزام اُلٹا ممتحن کے سر آجاتا تھا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

1962ء کے الیکشن پر بھی لوگوں سے طرح طرح کی باتیں سُننے کو ملتی رہی ہیں۔ کم عمری کی شہادت ثقہ اور قابل قبول نہیں ہوتی۔ شاہد کا عاقل اور بالغ ہونا ضروری ہے۔

1970ء کا الیکشن کہتے ہیں صاف، شفاف اور غیر جانب دارانہ تھا۔ مگر اُس کے نتائج تسلیم نہیں کیے گئے نتیجہ وطن عزیز کا دولخت ہونا تھا۔ اب ہم بالغ تو ہو چکے تھے مگر عاقل شاید نہیں کیونکہ وطن کی محبت کا جنوں سر پر سوار ہے اور وطن کے دولخت ہونے کا قلق داغِ لالہ کی طرح دل میں اب بھی موجود ہے۔ 1977ء کے الیکشن پر تو ایک ہنگامہ برپا تھا۔ زور آور ایمان افروز تحریک چلی۔ سکون تب ملا جب جنرل ضیاء الحق صاحب نے نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہِ الکریم کے پاکیزہ کلمات سے اپنی تقریر کا آغاز کیا تھا۔ یوں 11 برس اطمینان سے بسر ہوئے۔ اِس دوران 1985ء کے غیر جماعتی الیکشن بھی ہوئے جس کے نتیجے میں غیر جماعتی اسمبلیاں وجود میں آئیں لیکن وہ زمانہ

سیاسی افراتفری کے بغیر گزر گیا۔ پھر جنرل ضیاء الحق کے فضائی حادثہ کے سبب 1988ء کے الیکشن ہوئے۔ ایسے 1990ء، 1993ء اور 1997ء کے الیکشن میں دو ملکی بڑی پارٹیوں کی آنکھ مچولی دیکھنے کو ملی۔ ٹین پرسنٹ اور سنٹ پرسنٹ کے الزامات سُننے کو ملتے رہے۔ دونوں جماعتیں ایک دوسری کو کوس کر، الزام دے کر اور گلی کوچوں میں گھسیٹ کر عوام کا غصہ ٹھنڈا اور اُن کا دل بہلاتی رہیں۔ پارٹیاں تو اور بھی تھیں مگر عوام کا غم ان کو زیادہ تھا۔ جو غمِ عشق کی طرح بڑھتا ہی جا تا رہا۔ عوام بد دل ہوتے رہے، سہانے اور سندر خواب تعبیر نہ پا سکے۔ اکتوبر 1999ء میں جنرل پرویز مشرف کا مارشل لاء سب نے دیکھا۔ ایسے 2002ء میں الیکشن کی باز گشت سُنائی دی۔ قائدِ اعظم مسلم لیگ برسرِ اقتدار آئی۔ ایسے 2008ء، 2013ء اور 2018ء کے الیکشن پر طرح طرح کے خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ حقائق کون جانے اور کیوں جانے؟ سب کچھ معمول کی بات ہے۔ لیکن اب کی بار عاقبت نااندیشوں نے آسمان سر پر اُٹھا رکھا ہے۔ سوشل میڈیا کا بگاڑ ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ میڈیا میں بھی دو طرح کی لڑائی جاری ہے۔ کچھ حامی چند مخالف۔ ایک کے دوست دوسرے کے دشمن اور جو گلو گیر تھے اب بغل گیر ہیں۔ ایسے حالات میں دعا کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ خدا کرے کوئی ڈھنگ کا انتظام ممکن ہو جائے تا کہ ان شوریدہ سروں کو بھی آسودگی میسر آئے۔ ''شوریدگی کے ہاتھوں جن کا سر وبالِ دوش ہے۔'' الیکشن کمیشن کی ذمہ داری ہے کہ کوئی تدبیر کرے اور اعلیٰ تربیت یافتہ عملہ تیار کرے تا کہ جز وقتی عملہ کی غلطیوں سے بدنامی نہ ہو۔ اور اُن کی ناپختہ کاری کا الزام اُن کے سر نہ بندھے۔

ہاں بھلا کر ، ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

سب کچھ خدائے پاک کی توفیق سے ہی ممکن ہے۔ لہٰذا دعا ہے کہ یہ توفیق سب کو ارزاں ہو۔

بابِ دوم

اندازِ بیاں (چند تقاریر)

****

****

کچھ تقریر کے بارے میں

تقریر ہمارے خیالات کی زبانی تصویر ہے جو آواز کے قلم نے ہوا پر کھینچی ہے۔
تقریر اور مباحثہ اس کے دو رخ ہیں۔تقریر میں اپنی بات بتانی ہوتی ہے جبکہ مباحثہ میں اپنی بات سمجھانی ہوتی ہے۔تقریر کی تاریخ تحریر سے پُرانی ہے۔اِس کا دامن بہت کشادہ،اِس کا میدان بہت وسیع ہے۔محراب و منبر سے لے کر مقتل گاہوں تک، تعلیمی درس گاہوں سے لے کر سیاست کے ایوانوں تک، وہاں سے آگے بین الاقوامی اداروں تک اِس کا چلن یا کارفرمائی ہے۔گویا کارزارِ دہر کے متعدد معاملات میں اِس کے چرچے ہیں۔تقریر کا حُسن، اِنتخاب اور اختصار میں مخفی ہے۔ فصاحت و بلاغت اِس کا ضروری عنصر ہے۔تشبیہات و تلمیحات کے موزوں استعمال سے تقریر میں ثقاہت اور جاذبیت بڑھتی ہے۔اشعار کے برمحل اور درست استعمال کے ذریعہ اِس کی لطافت دو چند ہو جاتی ہے۔اعراب کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔اِس کے بغیر درست تلفظ ممکن ہی نہیں۔اعراب کو الفاظ کی جامہ زیبی کہنا ہو گا جس سے مفہوم واضح، تفہیم آسان اور تاثیر بڑھ جاتی ہے۔خیالات کی پراگندگی میں یکسوئی پیدا ہوتی ہے۔علم کی وسعت، فکر کی نُدرت اور بیان کا سلیقہ اِس کے بنیادی عناصر ہیں۔بیان کا علم انسان ہی کی فضیلت ہے۔ایرانی دانش ور علامہ مطہری نے گرہ کھولی ہے کہ خطابت ایک فن اور ایک ہُنر ہے۔اِسلام اِس کو دین کی کمک کے لیے استعمال کرتا ہے۔خطبہ نماز کا حصّہ بھی ہے اور رکعت کا ہم پایہ بھی۔جمعہ کے روز ظہر کی چار رکعت کی بجائے دو رکعت نماز ہوتی ہے اور دو رکعت کی چھوٹ جمعہ کی تقریریں سُننے کے لیے ہے۔ خطبے کے دو حصے ہیں: ایک حصہ میں خدا کی حمد و ثنا اور دوسرے میں لوگوں کے مسائل کا بیان ہوتا ہے۔''خطبہ حجۃ الوداع''، پیغمبرِ اسلام ﷺ کی وہ مایہ ناز تقریر ہے جو دنیا کا میگنا کارٹا قرار پائی ہے۔ خطباتِ مدراس (انگریزی زبان میں علامہ اقبال کی چھ تقاریر)، خطباتِ مدراس از سید

سلیمان ندوی اور خطباتِ بہاول پوراز پروفیسر حمید اللہ تقاریر کی مایہ ناز مثالیں ہیں۔ان کی تاثیر اور افادیت کا زمانہ گواہ ہے۔برصغیر پاک و ہند کی تاریخ مقررین سے بھری پڑی ہے۔مولوی نذیر احمد انگلستان کے برک سے بڑھ کر مقرر تھے۔خوش بیانی میں احراری نام ور تھے۔لوگ اُن کی تقریر سُنتے اور سر بھی دھنتے تھے مگر ووٹ مسلم لیگ کو دیتے تھے۔قائدِ اعظمؒ کی انگریزی تقریریں سمجھ نہ آنے کے باوجود اُن کے اعتماد پر پورا اُترتی تھیں۔مولانا محمد علی جوہر کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے تاریخی الفاظ ملاحظہ ہوں: ''ملک کے طول وعرض میں بس ایک ہی ہستی ایسی تھی جس کی آواز شمال نے بھی سُنی اور جنوب نے بھی، ہمالیہ کی بلندیوں نے بھی اور گنگا کی وادیوں نے بھی،خواص نے بھی سُنی اور عوام نے بھی،عالموں نے بھی اور جاہلوں نے بھی،بوڑھوں نے بھی اور بچوں نے بھی،آسام نے بھی اور سندھ نے بھی اور دیہات کے گنواروں نے بھی اور وائسرانگل لاج کی چمکتی اور جگمگاتی ہوئی بُرجیوں نے بھی اور جیل خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں نے بھی،راجوں مہاراجوں کے قصر وایوان نے بھی اور فاقہ کشوں کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں نے بھی۔مختصر یہ کہ محمد علیؒ نے اپنے کو اللہ کی خاطر،اللہ کے دین کی خاطر اور خدمتِ خلق کے لیے وقف کر دیا تھا۔خلق نے بھی اپنے تئیں محمد علیؒ کے لیے وقف کر دیا تھا۔''یقیناً جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک اعمال کرتے رہتے ہیں خدائے اَلرّحمٰن اُن کے لیے (خلق کے دل میں) محبت پیدا کر دے گا'' کی تفسیر لفظ و عبارت میں بہت دیکھی تھی؛ گوشت پوست کی مجسم تفسیر محمد علیؒ کی زندگی میں نظر آئی۔کسی نے کیا خوب کہا تھا:

بدین مصطفیٰؐ دیوانہ بودی　　فدائے ملتِ جانانہ بودی

آزادی کا یہ متوالا جس کی والدہ:

بولیں امّاں محمد علی کی　　جان بیٹا خلافت پہ دے دو

بیٹا جیل کے اندر سے کہہ رہا تھا:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے　　یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اور جس کا یہ شعر اُردو ادب میں گھل مل کر گویا ضرب المثل بن گیا ہے:

قتل حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے　　اِسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اور اُس کو لندن میں موت آئی عمر کُل ۵۲ سال پائی اور دفن کے لیے جگہ کہاں ملی! سرزمین قدس میں قبلۂ اوّل ہیکل سلیمانی کے قریب، جامع عمرؓ کے متّصل۔ اقبال نے کہا: ''ذرا دیکھنا اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ عاشق رشید وشیدا غلام جا کس راستے سے رہا ہے۔

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

مولانا محمد علی جوہر نے غلام وطن میں دفن ہونا گوارا نہ کیا اور دوسرے محمد علیؒ (جناح پونجا) قائدِ اعظم نے آزاد وطن حاصل کیا۔ قوم کو آزادی کی نعمت دی اور پھر جان جانِ آفریں کے حوالے کر کے آزاد وطن میں دفن ہوئے۔ اِسے نیرنگی زمانہ کہیے یا کچھ اور۔ سب اللہ کی توفیق سے ہے۔

☆☆☆☆☆☆

قائد کی یاد میں

قائدِ اعظمؒ بانیٔ پاکستان

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ اَمَّا بَعْد فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ

جنابِ صدر! معزز مہمانانِ گرامی قدر، معظم وموقر رفقائے کار، عزیز طلباء وطالبات! پیشتر از یں کہ سلسلۂ سخن شروع کروں مجھے اِس پُر وقار ایوان میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے تنگیِ داماں کا احساس ہو رہا ہے۔ میں بقول اقبالؒ :

اندازِ بیاں گر چہ بہت شوخ نہیں ہے　　　شاید کہ اُتر جائے تِرے دل میں مری بات

کہہ کر اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرتا ہوں۔

جنابِ صدر! آج ہم جس شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں، اُن کا تعلق تاریخ اور سیاست سے زیادہ اور زبان واادب سے قدرے کم ہے۔ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے جب علی گڑھ کالج سٹرپچی ہال ہجوم سے اور ہجوم جذبات سے بھرپور تھا۔ پروفیسر اے۔ بی حلیم صدر شعبہ تاریخ جلسے کی صدارت فرما رہے تھے۔ اُنھوں نے قائدِ اعظمؒ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ: ''جنابِ قائدِ اعظم! مجھے آپ سے ایک نسبت ہے۔ میں آج کل تاریخ پڑھا رہا ہوں اور آپ آج کل تاریخ بنا رہے ہیں۔ میں تاریخ کا طالب علم ہوں اور آپ سیاسیات کے اُستاد۔'' اُس روز اُن کی زبان سے برجستہ یہ جملہ نکلا اور تاریخی ہو گیا۔

جنابِ صدر! یوں تو کسی نے کیا خوب تجزیہ کیا ہے کہ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۰ء کے عشرے میں دنیا کی جن عظیم شخصیات نے جنم لیا، اُن میں قائدِ اعظمؒ، علامہ اقبالؒ اور مغرب میں چرچل کا نام لیا جا سکتا ہے۔ چرچل کے بارے میں کسی گم نام مصنّف نے پیش گوئی کی تھی کہ ایک دن یہ نوجوان

شاید انگلستان اور اس کی شکست کے درمیان حائل ہو جائے گا اور تنہا تاریخ کا رُخ موڑ دے گا۔

مگر کسے معلوم تھا کہ ۲۵۔دسمبر، ۱۸۷۶ء کو پیدا ہونے والا جسمانی اعتبار سے لاغر اور دبلا پتلا بچہ نہ صرف دنیا کی تاریخ بلکہ اُس کا جغرافیہ بھی تبدیل کر دے گا۔ پاکستان کا وجود بیسویں صدی کا بہت بڑا معجزہ ہے۔ ۱۴۔اگست، ۱۹۴۷ء سن ہجری کے اعتبار سے لیلۃ القدر کی نعمت ہے۔ اِس نعمت کو اگر شریعت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ نعمت ہزار گنا سے زیادہ قیمتی اور گراں قدر ہے۔

جنابِ صدر! یہ عجیب اتفاق ہے کہ برطانوی ہند کی سیاست پر سب سے زیادہ گہرے اثرات چھوڑنے والی دو اہم شخصیتوں کا آبائی وطن گجرات کاٹھیاواڑ تھا اور اُن دونوں نے اپنی اپنی عملی زندگی کا آغاز بمبئی سے کیا تھا۔ ان سے میری مراد موہن داس کرم چند گاندھی اور مسٹر محمد علی جناح ؒ ہیں۔ گاندھی جی کے سب منصوبے ناکام ہوئے اور وہ نامراد رہا۔ ستیا گری کی مٹی پلید ہوئی۔ آشرم بدنام ہو کر ٹوٹ گئے۔ ہندوستان تقسیم ہو کے رہا۔ ہندو مسلم اتحاد اور اقلیتوں کا تحفظ ممکن نہ ہو سکا۔ اچھوت، اچھوت ہی رہے اور چرخا چرخ کھا کر گر گیا۔ مگر قائدِ اعظم وقت کے تنہا رہنما قرار پائے اور حالات کی کربلا سے بھی سرخرو ہوئے۔ وہ وقت کے کوفہ میں بھی ثابت قدم رہے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کے حقوق کی آئینی جنگ جیت لی۔ اِس موازنہ سے گاندھی ایجی ٹیٹر تو لگتا ہے قائد نہیں۔ بلا شبہ قائدِ اعظمؒ کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جن کے بارے میں اقبال نے کہا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اور میر تقی میر کہہ گئے تھے کہ:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

جنابِ صدر! قائدِ اعظمؒ کا نام ہو یا کام دونوں باعثِ کشش اور باعثِ راحت و فرحت

ہیں ۔نام،کام سے افضل اور کام،نام کی بدولت ،گویا اِن کا نام دو حسین ترین ناموں ''محمدؐ'' اور ''علیؑ'' کا مجموعہ ہے ۔ایک وجہِ تخلیق کائنات اور دوسرا باعثِ تحسین کائنات ۔ناموں کے اِس عظیم تصرّف کی بدولت قائدِ اعظمؒ وہ کام کر گئے جو حالات کے مطابق محیّر العقول تھا۔آج میں جس قائد کی بات کر رہا ہوں وہ یکتائے روزگار تھے ۔اُن کی سیاست،فراست،ذات اور ذہانت اس عہد میں بے مثل تھی ۔اُن کا کردار بے داغ،اُن کی گفتار اللہ کی بُرہان تھی ۔اُن کی نظرِ انتخاب کو کیسے خراجِ عقیدت پیش کیا جائے ۔جب لنکنز اِن (Lincon's Inn) میں داخلہ لیتے ہیں تو اِس بنا پر کہ اُس کے بورڈ پر قانون دانوں کے ناموں کا آغاز حضورِ اکرم ﷺ کے نامِ نامی سے ہو رہا تھا۔حُسنِ انتخاب کا عالم ملاحظہ ہو کہ پیرس جیسی مارکیٹ میں نکٹائی کو سوٹ سے میچ کرنے میں پانچ گھنٹے صرف کرتے ہیں ۔اُن کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ قائدِ اعظمؒ،نہرو اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے درمیان کھڑے تھے کہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے سوال کیا کہ جناح دو رہنماؤں کے درمیان کیسے لگ رہے ہیں؟ جس پر قائدِ اعظمؒ نے فوراً جواب دیا ''جیسے دو کانٹوں کے درمیان ایک پھول ۔'' کسی صحافی نے سوال کیا کہ صدیوں سے ایک ساتھ بسنے والی قوم دو قومیں کیسے بن گئی؟ قائدِ اعظمؒ نے ایک جملہ کہہ کر نظریہ پاکستان پیش کر دیا:

"Whatever we eat they worship it."

شاید صحافی نے ہر جگہ ہندو پانی اور مسلم پانی ،پلیٹ فارموں پر ہندو چائے اور مسلمان چائے کے سٹالوں سے صرفِ نظر کر کے سوال پوچھا ہو گا۔

جنابِ صدر! حصولِ پاکستان کی منزل پانے کے لیے قائدِ اعظمؒ کو تین گروہوں سے بیک وقت مقابلہ کرنا تھا۔ایک گروہ انگریزی سرکار کا جو "Golden Sparrow" کے پر نوچنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے روپ میں آئے اور گھر والے بن بیٹھے ۔اُن کی عیاری اور مسلم کُش پالیسی کا مقابلہ کرنا تھا۔دوسرا گروہ ہندو اکثریت کا بھوت تھا جو اپنی ساہوکارانہ اور سرمایہ دارانہ چالوں سے مسلمانوں کی مفلوک الحالی کا سبب اور متحدہ ہندوستان کے دلفریب نعرے سے

سادہ لوح عوام کو گمراہ کر رہا تھا۔ وہ مسلمانوں کو اقلیتِ محض بنانے پر مصر تھا۔ اُن کا عمل دو دھاری تلوار کی مثل تھا جس نے جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسی ایثار پیشہ درس گاہ کے عمائدین کو جامعہ قومیہ ہندیہ کا کردار ادا کرنے پر آمادہ کرلیا۔

تیسرا گروہ اپنوں کی بے وفائی تھی۔ اِس میں اُن کی کج فہمی اور حالات سے ناآشنائی بھی شامل تھی۔ وہ بھی متحدہ ہندوستان کے راگ الاپ کر ''دھرتی ماتا'' کو تقسیم ہوتا نہ دیکھ سکتے تھے۔ بقول مختار مسعود اُن میں مقررِ شعلہ بیان بھی تھے اور قاریِ خوش الحان بھی۔ لوگ اُن کی باتیں سُنتے تھے اور اُن پر سر بھی دھنتے تھے۔ لوگ تقریر اُن کی سُنتے تھے اور ووٹ مسلم لیگ کو دیتے تھے۔ گویا رات گئی اور رات کی بات گئی۔

جنابِ صدر! ہندوستان کا مسئلہ کیا تھا؟ ۲۰ ویں صدی میں طرزِ حکومت کا انتخاب ایک بالکل نیا اور اہم تاریخی مرحلہ تھا۔ بادشاہت سے جمہوریت تک کے سفر کے لیے جو وقت درکار تھا وہ وقت برِ عظیم نے غلامی کی تاریک رات میں بسر کر دیا تھا۔ سیاسیات کی فکرِ جدید اور نظامِ حکومت کی طرزِ جدید کے مطابق اپنی منزل کا انتخاب کرنا ضروری تھا۔ یہ منزل اگر پاکستان نہ ہوتی تو مسلمان محض اقلیت ہوتے اور ہندو غالب اکثریت، اپنی من مانی کرتے۔ مختار مسعود لکھتے ہیں:

''برِ اعظم کے مسلمانوں میں ملت کے وجود کا احساس اور اس کے اظہار کے لیے ایک ریاست کی اساس رکھنا بارہویں صدی میں سلطان شہاب الدین غوری اور بیسویں صدی میں قائدِ اعظم محمد علی جناح ؒ کے حصے میں آیا۔ قائدِ اعظم نے حکومت میں حصہ نہیں لیا بلکہ برِّ اعظم میں اپنا حصہ مانگا۔ جس نے یہ مطالبہ سُنا اُسے حیرت ہوئی۔ بیشتر کو مسلمان اقلیت کی اِس جرأت پر اور کچھ کو مسلمان قیادت کی اِس فراست پر۔''

میرے نزدیک یہی وہ لمحات تھے جو صدیوں کو سرفراز کرتے ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو کشمیر کی غلامی کی داستان اور حال کا مطالعہ کریں۔ کشمیر کی غلامی کے اعلان کا لمحہ وہ لمحہ تھا جو صدیوں کو پُر ملال بنا دیتا ہے۔ آج اُنھیں اپنی آزادی کے لیے

گھر سے تا درِ زنداں اور وہاں سے مقتل تک

ہر امتحاں سے ترے جاں نثار گزرے ہیں

کی طرح ہر گھڑی آزمائش کا سامنا ہے۔ روندے ہوئے غنچے اور کہیں مسلی ہوئی کلیاں۔ ایوانوں سے بہت سی داستانیں وابستہ ہیں۔ آج وہ اپنے شہیدوں کے لہو سے عنوانِ زندگی تحریر کر رہے ہیں۔

جنابِ صدر! قائدِ اعظمؒ نے نہ صرف تین مذکورہ بالا گروہوں کا سامنا کیا بلکہ اپنی جیب کے کھوٹے سکوں سے بھی نبرد آزما ہونا تھا۔ غرضیکہ قائدِ اعظمؒ کو چومکھی جنگ لڑ کر یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آزادی اور حصولِ وطن کے اُونٹ کو کس کروٹ بٹھایا جائے۔ پورے مسلمانانِ ہند کی نظریں قائدِ اعظم پر لگی ہوئی تھیں۔ علامہ اقبال خط پر خط لکھ کر اس کا اظہار فرما رہے تھے۔ علامہ اقبال کے ۱۳ خطوط اِس کا بیّن ثبوت ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو قائدِ اعظم کو لکھا کہ: مسلم ہند آپ کی فراست سے توقع رکھتا ہے کہ اِس نازک مرحلے پر آپ اس کی مشکلات کا حل تلاش کریں گے۔'' تین ہفتے بعد اُنھوں نے لکھا کہ: ''پورے برطانوی ہندوستان میں تنہا آپ کی ذات ایسی ہے جس کی طرف مسلمانوں کی نظریں محافظت اور رہنمائی کے لیے اُٹھتی ہیں۔'' یہ حق شناسی کی وہ منزل تھی جہاں مرشد کسی ''مامور من اللہ'' کو پہچان لیتا ہے۔

جناب یہ سلسلہ معرفت اور نثر کا ہے۔ اگر بات مسلم سیاست اور نظم کی ہوتی تو علامہ اقبال اِس شعر کو قائدِ اعظم کی نذر کرتے:

می رسد مردے کہ زنجیر غلاماں بشکند

دیدم از روزنِ دیوار زندانِ شما

جنابِ صدر! کسی مفکر نے کتنی مزے کی اور پتے کی بات کہی تھی کہ بڑے آدمی انعام کے طور پر عطا کیے جاتے ہیں اور سزا کے طور پر روک لیے جاتے ہیں۔ قدرت اپنی ناشکری گوارا نہیں کرتی۔

کیا وجوہات تھیں کہ جو ملک ہم نے قائد اعظم کے چودہ نکات کی روشنی میں حاصل کیا تھا ،اُس میں سے آدھا ملک مجیب الرّحمن کے چھ نکات کی تاریکی میں گم کر دیا۔مینارِ پاکستان کی تعمیر کا عرصہ ۱۹۶۸ئ؁ تا ۱۹۷۳ئ؁ ہے۔اِسے کسی کی نظرِ بد کا قصور کہیے یا اپنی بے تدبیری کا نام دیا جائے کہ ابھی مینارِ پاکستان کی تعمیر بھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ پاکستان دولخت ہو گیا۔اندرا گاندھی نے جشن منا کر اعلان کیا کہ نظریہ پاکستان ختم ہو گیا مگر محرم راز داناؤں کا کہنا ہے کہ نظریہ پاکستان کی تدریس کی ضرورت دو چند ہو گئی ہے۔اگر تاریخ کے اوراق پر نظر دوڑائیں تو یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ ہمارے سامنے دو عہد ہیں۔ایک عہد ۱۹۴۷ئ؁ سے قبل اور ایک عہد ۱۹۴۷ئ؁ کے بعد،ایک عہد کا تعلق تحریکِ پاکستان سے اور دوسرے عہد کا تعلق تاریخِ پاکستان سے ہے۔دونوں عہدوں میں فکر اور خون کارشتہ ہے۔''فکر سے مراد فکرِ فردا اور خون سے مراد خونِ تمنّا ہے۔'' قائدِ اعظم نے فکرِ فردا کر کے ہمیں آزادی کی نعمت سے ہمکنار کیا اور ہم نے پاکستان دولخت کر کے اُن کی تمنّاؤں کا خون کر دیا۔

جنابِ عالی! غلطی نہ تاریخ معاف کرتی ہے اور نہ شریعت۔وہ ملک جو ہم نے سجدہ ریزیاں کر کے حاصل کیا تھا وہ اپنی غلطیوں،کوتاہیوں سے گنوا لیا۔اگر غلطیوں کا یہی انداز رہا تو کہیں ہمیں ''سجدۂ سہو'' ادا نہ کرنا پڑے۔

جنابِ صدر! قائدِ اعظمؒ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے لوگوں نے اپنی اپنی تقاریر و تحریروں پر خوب زور لگایا ہے۔میرے نزدیک علامہ اقبالؒ جس آدم کی تلاش میں نکلے تھے وہ اُنھیں قائدِ اعظمؒ کے روپ میں میسر آیا ہے۔اُن کے اشعار کے مطالعہ سے جو کردار ذہن میں آتا ہے وہ قائدِ اعظمؒ کے بہت قریب ہے۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی ۔۔۔ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم ۔۔۔ دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم ۔۔۔ رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

نرم دمِ گفتگو ، گرم دمِ جستجو رزم ہو یا بزم ہو پاک دل، پاک باز

اقبالؒ کے یہ اشعار قائد کے حضور پیش کیے جا سکتے ہیں جو اُن کی شخصیت کا پرتو ہیں۔ قائدِ اعظمؒ کے اوصاف کی فہرست خاصی طویل ہے۔ اوصاف کے بہت سے پیرہن ہیں جو اُن کی قامت پر راست آتے ہیں۔ مگر سب سے اہم بات وہ بکے نہ جُھکے۔ بقول شاعر: ؎

لاکھوں میں فقط ایک مسلماں دیکھا میدانِ سیاست میں نمایاں دیکھا

جو بِک نہ سکا غیر کے ہاتھوں محسن وہ قائدِ اعظم ترا ایماں دیکھا

جنابِ صدر! عرصہ چالیس پینتالیس برس قبل جب میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو مسٹر جناح کو عوام النّاس ''بابا قائدِ اعظم'' کہہ کر پکارتے تھے۔ آج جب تجزیہ کرتا ہوں تو عوامی محبت کا سیل رواں اِس ترکیب میں محسوس کرتا ہوں۔ ''قائدِ اعظم'' کے لفظ میں وقار ہے جس سے سیاسی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ جب کہ لفظ ''بابا'' میں شخصیت کی گرمی اور اپنائیت کا اظہار ملتا ہے۔ بابا قائدِ اعظم ایسا باپ تھا جس نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی عزتِ نفس اور تحفظِ جان و مال کے لیے زندگی کی آخری اور فیصلہ کُن جنگ لڑی اور جیتی۔ اُنھوں نے اپنا آرام، اپنی صحت، اپنی دولت، سب کچھ قربان کر دیا تا کہ ہم آزاد ملک کی فضاؤں میں اپنے دستورِ حیات (اسلامی دستورِ حیات) کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور ان نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکیں جو اِس عمل کا منطقی ثمر ہے۔ بقول شاعر: ؎

صفیں کج تھیں، تنظیمِ نو اُن کو بخشی
پریشاں دِلوں کو یقیں اُس نے بخشا
جو بھٹکے ہوئے تھے اُنھیں منزلوں کی بشارت عطا کی
جو بزدل کمیں گاہ میں سہمے کھڑے تھے
اُنھیں زندگی دی، جسارت عطا کی
وہ تنہا چلا تھا مگر جب سرِ شام منزل پہ پہنچا
تو اُس کے جلو میں بڑا قافلہ تھا

اُٹھائے ہوئے چاند تاروں کا پرچم
خدا کی زمیں پر بالآخر کھڑا تھا

جنابِ صدر! ''قائدِ اعظم'' پر تو کتابیں تحریر ہو چکی ہیں۔ اِس محفل میں اُن کی شخصیت کا احاطہ ممکن نہیں ہوگا۔ آخری بات کہہ کر اجازت چاہوں گا۔ آج اگر چہ قائدِ اعظمؒ ہم میں موجود نہیں ہیں مگر ہم اُن کے ذکر سے اپنے فکر کی شمع فروزاں کیے ہوئے ہیں۔ آئیے اس دن کی نسبت سے تجدیدِ عہد کریں کہ ہم اپنے عمل سے قائد کی روح کو راحت و آسودگی بہم پہنچائیں گے اور قائد کے وطن پاکستان کو ''خونِ دل دے کے نکھاریں گے رخِ برگِ گلاب'' کا عہد کریں۔ جہاں تہاں عقابوں کے نشیمن پر زاغوں کا تصرف دیکھیں گے اُسے ہٹانے کی سعی فرمائیں گے۔

جنابِ صدر! اگر چہ میرے رفقائے کار کا منصب یہ سیاست بازی ہے نہ تاریخ سازی، مگر فکر سازی ضرور ہے۔ آئیے عہد کریں کہ قائدِ اعظمؒ کے نصب العین ''ایمان، اتحاد، تنظیم'' پر عمل پیرا ہو کر نوجوان نسل کو "Enter to Learn and leave to Serve" کا عملی پیغام ازبر کروا دیں۔ اپنے مال مست امیروں اور حال مست فقیروں کی صحیح سمت رہنمائی کریں۔ یہی منزل ہماری فلاح اور راستی کی منزل ہے۔ یہی منشاء مضبوط پاکستان کی دلیل اور استحکامِ پاکستان کی اساس ہے۔

(کالج کی قائدِ اعظم سوسائٹی کے زیرِ انتظام، قائد کے حوالے سے منعقدہ ایک پروگرام میں پڑھا گیا)

مآخذات:

۱۔ آوازِ دوست از مختار مسعود
۲۔ قائدِ اعظمؒ نمبر گورنمنٹ کالج سرگودھا
۳۔ قومی رسائل و اخبارات
۴۔ کلامِ اقبالؒ

ہمارے قومی شاعر

(پرائمری کی سطح کے بچوں کے لیے)

جنابِ صدر! سامعین کرام!

اقبالؒ ہمارے وہ فلسفی شاعر ہیں جنھوں نے اپنے پیغام سے قوم کو سکوں بھی پہنچایا، محفل کا دل بھی تڑپایا:

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے نہ جانیے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی دل محفل کا تڑپا بھی گئی (اقبال)

اقبالؒ کا پیغام تین زبانوں اور تین زمانوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ماضی کی عظمت، حال کی بدحالی اور مستقبل کے روشن امکانات کا تصوّر ہر جگہ موجود ہے۔ اقبال کی شہرت بین الاقوامی ہے۔ دُنیا کی متعدد زبانوں میں اُن کے پیغام کے تراجم ہو چکے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ کے شہر میں پیدا ہوئے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ: ''جب اُن کی والدہ نے اُن کا نام اقبال تجویز کیا تو قبولیتِ دعا کا وقت تھا۔

پھر اقبال کو وہ اقبال نصیب ہوا جو دنیا میں بہت کم کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اُنھوں نے بڑوں کے لیے ہی نہیں بلکہ بچوں کے لیے نظمیں لکھ کر اُن کو بھی اپنے پیغام میں شامل کیا ہے۔ ''ایک مکڑا اور مکھی''، ''ایک پہاڑ اور گلہری''، ''ایک گائے اور بکری''، ''ہمدردی''، ''ماں کا خواب''، ''پرندے کی فریاد'' وغیرہ لیکن ''بچے کی دُعا'' میں کس طرح تمنّا نے دُعا کا رُوپ دھارا ہے:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
میرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو نیک جو راہ ہو اُس رہ پہ چلانا مجھ کو

دو بند اور چھ اشعار پر مشتمل اِس نظم کا طلسم ہر عہد میں فزوں تر ہوتا جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے مندرجہ ذیل کُتب لکھی ہیں جو اُن کے پیغامِ حُرّیت، بیداری، توحید

****

الٰہی، عشقِ محمدؐ، قرآن کی تعلیمات اور رجائیت سے لبریز ہیں۔

''بانگِ درا''، ''اسرارِ خودی''، ''رموزِ بے خودی''، ''پیامِ مشرق''، ''زبورِ عجم''، ''جاوید نامہ''، ''بالِ جبریل''، ''ضربِ کلیم''، ''ارمغانِ حجاز''، ''مثنوی پس چہ باید کرد مع مسافر'' اور ''سرودِ رفتہ'' کے علاوہ انگریزی خطبات اُن کے علمی پایہ کا پتا دیتے ہیں۔ اُن کی زندگی اور فکر پر لکھی جانے والی کتب اور رسائل کی تعداد ہزاروں میں بنتی ہے۔

آخری بات! اقبال وہ عظیم فلسفی شاعر ہیں جن کی بارگاہ میں آ کر مشرقی اور مغربی علوم کے دھارے مل جاتے ہیں۔ اُن کے ایک ایک مصرعے کو موضوع بنا کر کتب تحریر ہو سکتی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

****

موبائل فون رحمت یا زحمت

(مباحثہ)

جنابِ صدر! پیشتر ازیں کہ سلسلۂ سخن شروع کروں مجھے اِس پُر وقار ایوان میں اظہار خیال کرتے ہوئے تنگیٔ داماں کا احساس ہو رہا ہے۔میں بقول اقبال رحمۃ اللہ علیہ یہی کہوں گا کہ:

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات

جنابِ صدر! معزز سامعین و ناظرین باتمکین!

جیسے کہ آج یہ موضوع زیرِ بحث ہے ”موبائل فون رحمت یا زحمت۔“ نہایت معقول اور سوچا سمجھا عنوان ہے: اس کی افادیت اور رد میں دلائل کے انبار ہیں۔لیکن میرا زاویہ نگاہ یہی ہے کہ ”موبائل فون ایک رحمت ہے۔“ اِس نے زمین کے فاصلوں کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔دنیا ایک گلوبل ویلیج کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔اپنوں کے پیغام حاصل کرنا، اُن کی عافیت کی خبر دریافت کرنا، اُن کے دکھ درد میں شامل ہونا میراثِ آدم ہے۔اپنا پیغام اپنے عزیز و اَقارب کو پہنچانا، معاملاتِ زندگی کے بارے میں دوسروں کو مطلع کرنا انسانی آرزو ہے۔انسان حیوانِ ناطق ہے۔۔اور نطق کو لبِ اعجاز پہ سو ناز ہیں۔یہ سارا کام موبائل فون نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

جنابِ صدر! پیغام رسانی اور مواصلات کے جدید ذرائع کا یہ سلسلہ جسے ہمارے اسلاف کبھی کبوتروں کے ذریعے، کبھی تیز رفتار گھڑ سواروں کو دوڑا کر............انجام دیتے تھے، آج آنِ واحد میں گھر بیٹھے بٹھائے، دُنیا کے کسی گوشے میں، پہاڑوں کو سر کر کے، دریاؤں کو عبور کر کے،

صحراؤں کے اُس پار، گلفام وادیوں میں، لہلہاتے مرغزاروں میں ایک بٹن کی حرکت سے انجام پاتا ہے۔

مِرے ذوقِ تسخیرِ فطرت کے آگے
عناصر کا قلب و جگر کانپتا ہے

جنابِ صدر! آج کے ناقدین جو موبائل فون کو زحمت قرار دینے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں یہ اُن کی اپنی سوچ ہے۔ ایسے احباب گلاس کو ہمیشہ آدھا خالی ہی دیکھتے ہیں............ اِن قنوطیت کے ماروں کو صرف یہی اِدراک ہے کہ خدا نے آنکھیں رونے کے لیے بنائی ہیں۔ جبکہ معاملہ اِس کے بالکل برعکس ہے۔ جس خدائے ذوالجلال نے نظاروں کو رعنائی عطا کی ہے اُسی نے آنکھوں کو بینائی عطا کی ہے تاکہ وہ حسنِ مطلق کی دائمی اور ازلی دید سے بہرہ ور ہوسکیں۔

جنابِ صدر! آج کے پُروقار ایوان میں مجھے اِس اعتراف میں سو فیصد صداقت نظر آتی ہے کہ ''موبائل فون ایک رحمت ہے۔'' اس کی صداقت آج کے اندھوں کو شاید نظر نہ آئے۔ اُن قبر والوں سے پوچھو جو اپنوں کی جدائی میں تڑپ تڑپ کر مر گئے۔

تِرے فراق کے لمحوں میں دل نے سوچا ہے
تِرے وصال کے دن کتنے مختصر ٹھہرے

جنابِ صدر! موہوم اور موجود کا جھگڑا ازل سے ہے:۔ افادیت اور غیر افادیت کی بحث بہت قدیم ہے۔ رحمت اور زحمت کا فرق زاویۂ نگاہ کا فرق ہے:۔ ایک کا ستم دوسرے کی ادا ہوتی ہے۔ ایک پر جفا دوسرے کے لیے وفا ثابت ہوتی ہے۔

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں، سو یہ بھی کیا معلوم

میں نے عرض کیا کہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ ملکۂ نطق و گویائی تمام انسانی صلاحیتوں کا جوہرِ قابل ہے۔ قوتِ گویائی کی بنا پر انسان کو حُسنِ تخلیق کا شاہکار کہا گیا ہے۔۔ اسے تمام ذی روح

مخلوق پر برتری کا شرف بخشا گیا ہے۔اس کے دل میں کہنے اور سُننے کی خواہش فطری ہے۔یہ دونوں کام موبائل فون سے انجام پاتے ہیں۔کان اور آنکھ کی نعمت سے کسے انکار ہے۔زبان و نطق ہی انسانی امتیاز ٹھہرا۔

جنابِ صدر! نعائمِ فطرت ہوا، پانی اور روشنی کی اہمیت اور افادیت سے کون انکار کرسکتا ہے؟ یہ تمام نعمتیں انسانی زندگی کے لیے کس قدر ارزاں ہیں............عام ہیں...... اِن کے معمولی پن میں ان کا غیر معمولی پن مخفی ہے۔یہ راز ہے جسے اہلِ نظر ہی جانتے ہیں۔لیکن ہوا کی تُندی دیکھ کر، پانی کی کثرت کے بہاؤ میں چند بہتی لاشوں کو دیکھ کر روشنی اور آگ کی حدت کے منفی اثرات کو دیکھ کر اُن کی افادیت سے انکار یا صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔

ایسے ہی موبائل فون کے بے جا استعمال میں موبائل فون کا نہیں، عقلِ انسانی کی عیاری کو دخل ہے۔

جنابِ صدر! آخری بات یہ کہ موبائل فون نے خدمتِ خلق کے شعبہ سے لے کر ایوانِ سیاست میں، مواصلات سے لے کر میدانِ تجارت تک .... غرضیکہ دنیا کا کوئی شعبہ، کوئی کونہ، کوئی طبقہ، کوئی صنف، کوئی نوع ایسی نہیں جو اِس سے بہرہ ور نہ ہو رہی ہو............۔

دنیا بھی اِک بہشت ہے، اللہ رے کرم!
کِن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

ہم اپنے کردار کے امین ہیں

صدرِ ذی وقار! سامعین کرام! حاضرین وناظرین باتمکین!

آج کا زیرِ بحث موضوعِ سخن جیسے الفاظ کی سلک میں پرویا ہے: ’’ہم اپنے کردار کے امین ہیں‘‘ اپنے باطن میں لمحۂ فکریہ بھی رکھتا ہے اور دعوتِ عمل بھی۔ ہم امتِ مسلمہ کے خوشہ چین، سُنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پیروکار، اصلاحی روایات واعلیٰ اقدار کے پاسبان ہیں۔ ملت کی نگاہیں ہماری طرف اُٹھ رہی ہیں۔ کہ ہم اپنے عمل وکردار سے عظمتِ رفتہ اور کھویا ہوا نشیمن کیسے حاصل کرسکیں گے۔ تمنّاؤں کا دشتِ امکان کیسے ہمارا نقشِ پا ہوگا۔ رہا کردار تو زندگی باتوں سے نہیں بنتی بلکہ حُسنِ عمل اور اعلیٰ اقدار سے سنورتی ہے۔ یقینِ محکم اور عمل پیہم کے دھارے کردار کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ جہادِ زندگانی میں یہی مردوں کی شمشیریں ہیں۔ دنیا کی عمارت کے چار ستون ہیں: ۔ ۱۔ وہ علم جو علماء کے سینے میں ہو۔ ۲۔ وہ عدل جو ارکانِ حکومت کے اِرادوں میں پایا جائے۔ ۳۔ وہ دعا جو صالحین کے دِلوں سے نکلے۔ ۴۔ وہ جلال جو بہادروں کے تیور سے ظاہر ہو۔ اِن سب کی اساس اور مرکز ومحور اعلیٰ کردار ہی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے: ’’جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز۔‘‘ اب رہا معاملہ امین کا تو بقول علامہ اقبالؒ بندۂ مومن امین ہے، حق تعالیٰ مالک ہے۔ خدا کی چاہت بندۂ مومن کی چاہت ہے۔ امانت ودیانت کا مظہرِ اتم پیغمبرِ آخر الزّماں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ پاک ہے۔ فاران کی چوٹیوں سے صفا مروہ کی پہاڑیوں سے، مکہ کے طول وعرض سے، مدینہ پاک کے بازاروں سے، نجاشی کی عدالت اور قیصرِ روم کے دربار سے ایک ہی صدا سنائی دے رہی ہے کہ آپؐ صادق اور امین ہیں۔ آپؐ صادق اور امین ہیں۔

جنابِ صدر! آئیں تاریخ کی سیر کریں۔ جب تک امتِ مسلمہ کے افراد حامل کردار تھے تب تک افریقہ کے تپتے صحرا اور یورپ کے کلیساؤں میں اذان کے روح پرور کلمات کی صدائیں گونجتی تھیں۔ صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا، نوعِ انسانی کو غلامی سے چھڑایا، کعبے کو جبینوں سے

سجایااور قرآن کو سینوں سے لگایا۔ صفحۂ دہر میں کتنی اقوام تھیں لیکن خدا کے نام کی سربلندی کا بیڑہ ہم نے اُٹھایا۔ خوگر پیکرِ محسوس اقوام کو ان دیکھے خدا پر ایمان لانے کا فریضہ سرانجام دیا۔

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سُنایا ہم نے

بحر کبھی ہمارے سفینوں کا بازی گاہ تھا۔ قصرِ زہرا، مسجدِ قرطبہ، اور الحمرا کی زبان پر ہماری داستانیں ہیں۔ چار دانگِ عالم میں ہمارے چرچے تھے۔ ہم اگر ٹیگس پر گرجے تو گنگا پہ برسے۔ لیکن اب:
گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی۔ نتیجہ سامنے ہے۔ ایران و تبریز تو ہیں، کوئی رومی نہیں، رسمِ اذاں تو ہے، روحِ بلالی نہیں، فلسفہ موجود مگر تلقین غزالی نہیں، قافلۂ حجاز تو موجود مگر اِک حسین بھی نہیں۔ واعظِ قوم کی پختہ خیالی رُخصت ہوئی۔ برقِ طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی۔

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

صاحبِ صدر! قحط الرّجال کا سماں ہے۔ دولت کا سیلاب قناعت نایاب، علم دوستی دریا بُرد، ہوش و خرد مئے ناب میں غرق، دردِ دل کی متاع رخصت، نظامِ عالم کی بنیاد جس خودی پر تھی وہ بےخودی کے بحر میں ڈوب چکی ہے۔

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنّا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
اِقبال بڑا اُپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی یہ تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

فلسطین کی لہو رنگ فضا، وادیِ کشمیر کے جذبات کی دھڑکنیں، شام و عراق کے حالات ہمارے کردار کو پکار رہے ہیں۔ ہم کہاں ہیں؟ کثیر مسلم آبادی، کوڑیوں ممالک کی حکمرانی، معدنی تیل کی دولت، آزادی کی نعمت، مگر بے کسی اور بے بسی کا یہ عالم حیرت زا ہے۔ ریگِ عراق منتظر، کِشتِ حجاز تشنہ کام۔ ہمارے کردار کو پکار رہا ہے۔ بہترین معاشرہ جس کا نام اُمت ہے، جس کا

ایمان ایک اور ہدف مشترک تھا، اب کہاں ہے؟ لیکن!

جنابِ صدر! ''لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰہِ'' فرمانِ الٰہی ہے۔ اقبال اپنی کشتِ ویران سے ناامید نہیں ہے۔ ''کم کوش تو ہیں، بے ذوق نہیں راہی۔'' یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔ ہمیں اپنے عمل پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ عقیدے کی برتری اور عمل کی برگزیدگی کی طرف بڑھنا ہوگا، اپنے جذبات اور جبلتوں پر قابو پا کر ہوش و خرد کے ناخن لینا ہوں گے۔ اسلامی روشن تعلیمات پر گامزن ہونا ہے۔ عارضی زندگی کا دوام کردار سے ہے۔ راہِ عمل پر گامزن ہی محبوب فطرت ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ۔ صاحب کردار لوگ اللہ سے مرادیں نہیں مانگتے بلکہ عمل کی توفیق مانگتے ہیں کیونکہ مرادیں عمل سے وابستہ ہیں۔

جنابِ صدر! آخری کلمات کے بعد اجازت چاہوں گی۔ بے شک ہم اسلاف کے کردار کے امین ہیں۔ صداقت، عدالت، شجاعت جن سے امامتِ عالم کا دامن وابستہ ہے، ہم اُن کے پیروکار ہیں۔ توحید کی نعمت ہمارے سینوں میں مستور ہے۔ سنتِ نبویؐ کے موتیوں سے ہمارا دامن گُہر بار ہے۔ قرآنی تعلیمات ہمارے لیے چراغِ راہ ہیں منزلِ مقصود کی رہنما بھی ہیں۔ ہم جوہرِ آئینۂ ایام ہیں، زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہیں۔ خلافت کی ابدیت کا وعدہ ہم سے ہے۔ تم ہی غالب آؤ گے اگر مومن ہوئے تو............

اقبالؒ کے الفاظ میں: جوابِ شکوہ کا چھتیسواں آخری بند:۔

۱۰۲ عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری
مِرے درویش خلافت ہے جہانگیر تری

۱۰۴ ما سوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

۱۰۸ کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

☆☆☆☆☆

اختر شیرانی کی شاعری اور حب الوطنی

جنابِ صدر! مہمانِ خصوصی اور حاضرین و ناظرین با تمکین!

قبل اِس کے کہ سلسلۂ سخن شروع کروں، مجھے لب کشائی کرتے ہوئے تنگیِ داماں کا احساس ہے۔ میرے ساتھ بقول اختر شیرانی:

ناچیز ہوں ، ہمت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

والا معاملہ ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے: ''سچ تو یہ ہے کہ حضرت اختر کی خصوصیات و محاسن بیان کرنا میرے بس کا روگ نہیں۔ اُن کی شاعری جذبات کا طوفان ہے۔ شاعری کی زبان اور بنیادی خصوصیت اُن کی موسیقیت و غنائیت ہے۔ یہ غنائیت صرف اُنھی سے مخصوص ہے اور اُنھی کا حصہ ہے۔ اِس غنائیت اور موسیقیت سے اُن کی شاعری کو الگ کر کے دیکھنا گوشت کو ناخن سے الگ کرنے کے مترادف ہے۔'' (م۔ع۔سلام)

جنابِ صدر! پرانی شاعری دربار کے آس پاس رہتی تھی۔ نئی شاعری کا ٹھکانہ اندرون شہر کے ایک محلّے میں واقع ہے جس کے کچھ حصے کچی آبادی پر مشتمل ہیں۔ وہ شاعری خیال کی دنیا میں رہتی تھی۔ یہ حقیقت سے بہت قریب ہے۔ خیالی محبوب کی جگہ عوام، کوچۂ محبوب کی جگہ وطن نے لے لی ہے۔

مجھے آج اِس پُر وقار تقریب میں اختر شیرانی اور حُبّ وطن کے موضوع پر گفتگو کرنی ہے۔ اُن کی ایک نظم ''ایک عزیز کی واپسی یورپ پر'' 10 اشعار مشتمل نظم کے دو شعر حاضرِ خدمت ہیں:

مضطرب تھا تِرا محبوب وطن تیرے لیے
خاک برسر تھا یہ شاداب چمن تیرے لیے

دلِ اختر سے نکلتی ہے یہ مستانہ دعا
تُو وطن کے لیے ہو اور وطن تیرے لیے

وطن سے محبت کا بھرپور اظہار اُن کی نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' (یہ دراصل ایک نووارد ہم وطن سے کسی غریب الوطن کا خطاب ہے) سے ہوتا ہے۔ جُزیات نگاری میں 33 بندوں پر مشتمل یہ نظم اپنی مثال آپ ہے۔ جیسے:

او دیس سے آنے والے بتا
او دیس سے آنے والے بتا
کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سُنا
کس حال میں ہیں کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن فردوسِ وطن
وہ سروِ وطن ، ریحانِ وطن
او دیس سے آنے والے بتا

☆☆☆

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وطن میں ویسے ہی
سرمست نظارے ہوتے ہیں
کیا اب بھی سہانی راتوں کو
وہ چاند ستارے ہوتے ہیں
ہم کھیل جو کھیلا کرتے تھے
اب بھی وہ سارے ہوتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

اِس ساز کی آواز ''نذرِ وطن'' میں یوں سنائی دیتی ہے:

نذرِ وطن پھر اے دلِ دیوانہ چاہیے
پھر ہر قدم پہ سجدۂ شکرانہ چاہیے
پھر سرزمیں وطن کی ہے نظروں کے سامنے
پھر لب پہ ایک نعرۂ مستانہ چاہیے
اختر وطن میں آکے کھلا یہ حسین راز
اِس مختصر سی عمر میں کیا کیا نہ چاہیے

اختر صرف آپ ہی نہیں بلکہ اوروں کو بھی وطن کے نغمے گانے کی دعوت دیتے ہیں:

نغمۂ حُبّ وطن گاتے چلو
جنگ کے میدان کو گرماتے چلو
دھوم سے مثلِ طوفان آگے بڑھو
رعد اور باراں کو شرماتے چلو

اختر کبھی وطن کی آنکھ کے تاروں کی تلاش میں نغمہ زن ہیں:

پیارے وطن کی آنکھ کے تارے کدھر گئے
بادِ خزاں! وہ پھول ہمارے کدھر گئے
جن کے دلوں میں عشقِ وطن تھا شرارہ ریز
ہاں وہ وطن کے عشق کے مارے کدھر گئے

وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ اس کی مٹی سے محبت انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ یہی پاک جذبہ اُسے مقتل میں لے جاتا ہے۔ اختر شیرانی دلیرانِ وطن کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

سر کٹا کر سر و سامانِ وطن ہونا ہے
نوجوانو! ہمیں قربانِ وطن ہونا ہے

ان گلوں پر نہ ہو کیوں خلد کو بھی رشک، جنھیں
زینتِ گورِ شہیدانِ وطن ہونا ہے

جنابِ صدر! اختر شیرانی کا دور عجیب متشائم دور ہے۔ 1905ء تقسیمِ بنگال کا سال تھا۔ 1909ء منٹو مارلے اصلاحات، 1919ء کی اصلاحات، 1929ء سائمن کمیشن رپورٹ، تین گول میز کانفرنسیں ((32-1930 کے نتیجہ میں 1935ء کا ایکٹ، 38-1937ء کی صوبائی حکومتیں اور 10 سال بعد سرکار برطانیہ کو قانونِ آزادیِ ہند منظور کرنا پڑا۔ پسماندہ مسلمانوں نے دو طاقتوں کا مقابلہ کیا۔ تاجِ برطانیہ اور ملک کی خوشحال اور تعلیم یافتہ اکثریت۔ اِس کے پس منظر میں بہت سے عوامل کے ساتھ صادق جذبوں پر مشتمل شاعری کا بڑا حصہ ہے۔ پنجاب میں اقبال اپنی شاعری میں واقعاتِ رفتہ کے حسین مرقعے دِکھا کر امُتِ مسلمہ کے تن مردہ میں آزادی کی روح پھونک رہے ہیں۔ لکھنؤ میں چکبست اپنے مخصوص انداز میں رامائن اور مہابھارت کی طویل داستانیں سناتے نظر آتے ہیں۔ وطنیت اور آزادی کے جذبہ سے سرشار نظمیں اُن کی شاعری کا حصہ ہیں۔ جوش (شاعرِ انقلاب) جن کے کلام اور تخلّص میں بہت مماثلت ہے، انقلاب زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں۔ جہاں سیماب، جگر، عزیز آزادیٔ وطن کی بات کرتے ہیں، وہاں اختر شیرانی بھی وطن کی آزادی کے لیے بے تاب اور دُعا گو ہیں۔ ''گل بانگِ قفس'' سے دو شعر قارئین کی نذر ہیں:

ہر ایک قدم یاں مجلسِ غم، ہر تازہ ستم اِک مِصرِ الم
اِس حال میں پوچھیں کس سے یہ ہم، غم دیدۂ کنعاں کیسے ہیں
گلبانگِ قفس ہی بن جائے اے کاش نوائے آزادی
کیا کہیے اختر سینے میں مچلے ہوئے ارماں کیسے ہیں

جنابِ صدر! اختر شیرانی کا دور، انقلاب کی خواہش، حصولِ آزادی کی کوشش کا دور ہے۔ ہر صاحب دل موجود سے دل برداشتہ، حال کا ماتم کناں اور بہتر مستقبل کا خواہاں ہے۔ وہ اِس نفرت گاہِ عالم کو چھوڑ کر طور کی وادی میں، نور کی وادی میں بسنا چاہتا ہے۔ یہ نور کی وادی، یہ امن کا مسکن وطن عزیز بھی ہو سکتا تھا، اگر صلاحیت کی بنیاد پر صالح قیادت نصیب ہو جاتی ''بسا آرزو کہ خاک

شد۔" شاعر ایک جنگی ترانے "بڑھے چلو" جو 48 اشعار پر مشتمل نظم ہے میں لکھتے ہیں:

اُٹھاؤ تیغ بے اماں، وطن کے پاک نام پر
لٹا دو عمرِ نوجواں، وطن کے پاک نام پر
نثار کر دو اپنی جاں، وطن کے پاک نام پر
صدائیں دیتا ہے وطن، بڑھے چلو بڑھے چلو
دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو بڑھے چلو

جنابِ صدر! غور طلب نکتہ آزادی، حُبِّ وطن، انقلاب، نغمۂ حرم، نعت گوئی میں بلند مقام کے حامل شاعر جن کے نغموں میں زندگی، جوش، حُسن، اصلیت، سوز، روانی، ترنم، شباب، مسرت، محبت و الفت، ہیجان غرضیکہ سبھی کچھ ہو اُنھیں بقول ڈاکٹر محمد حسن: "محض شاعرِ رومان نہیں کہا جا سکتا۔" بلکہ بقول کنیز فاطمہ حیا: "حضرت اختر کی شاعری میں روحِ عصر پنہاں ہے۔ وہ ایک نوجوان شاعر ہیں جو اپنی شاعرانہ خصوصیات میں کوئی دوسرا حریف نہیں رکھتے۔ وہ حسن کارانہ انداز میں "جمالیاتِ نغمہ" کی تفسیر خوب کرتے ہیں۔"

کہو زاہد سے، نہ ہو اِس قدر فردوس پر نازاں
ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخئیل اختر میں

آغا حشر کاشمیری

جنابِ صدر! دراصل اختر شیرانی کی شاعری تحریکِ علی گڑھ کی مقصدیت، منطقیت اور اخلاقی نظریوں کے برعکس فضا، فطرت، فطرت کی رنگینیوں اور انسان کا جوش و جذبہ ہے اور وطن کے نغموں سے معمور ہے۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ اُن کے ہم عصر شعراء نے بالعموم فیض احمد فیض اور ناصر کاظمی جیسے باکمال شعراء نے بالخصوص اُن کے شاعرانہ آہنگ اور موضوعات کو اپنایا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے: "اپنی خصوصیات کی وجہ سے کم عمری میں اختر شیرانی نے پختہ کاروں کا رنگ اختیار کر

لیا تھا۔ اُن سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن عمر نے وفا نہ کی۔"

میرے خیال میں عمر کی یہ بے وفائی تو "KEATS" A thing of beuty
is joy for ever. اور انقلابِ ایران کے مفکر ڈاکٹر علی شریعتی کے حصے میں بھی آئی تھی۔
مشیتِ ایزدی ہے۔ دم مارنے کی مجال نہیں۔

جنابِ صدر! آخری بات: تقریر کی تنگنائی کا دامن اِس بات کا متحمل نہیں ہوسکتا کہ وہ تحقیقی امور کے تقاضے پورے کرے۔ یہ تحقیقی کام کرنا ابھی باقی ہے کہ اختر شیرانی کی نظموں میں صُحُفِ سماوی کا اسلوب اور آہنگ ملتا ہے۔ صفات کے کتنے اور پیرہن ہیں جو "رومان" کے علاوہ اُن کی قامت پر راست آتے ہیں۔ اُن کی شاعری کے علاوہ نثر کی بزم گاہ کے کتنے پنہاں گوشے ہیں جنھیں منظرِ عام پر لانے اور اُن کے حواشی لکھنے کی ضرورت ہے۔ ابھی بہت سا تحقیقی کام کرنا باقی ہے۔ دیکھیے یہ سعادت کس کس کے حصے میں آتی ہے؟

☆☆☆☆☆☆

ڈاکٹر شیرانی کی تین کتب

جنابِ صدر! سامعین و ناظرین باتمکین! السّلام علیکم! بے شک ڈاکٹر صاحب آج ہم میں نہیں ہیں مگر اُن کی یادیں تازہ ہیں۔ موسم گزر جاتے ہیں مگر یاد نہیں گزرتی۔ مرحوم زمانوں کی تادمرحوم نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں نا! کہ ماضی کی یاد انسان کے وجود کو ڈھانپ لیتی ہے۔ لباس کی طرح نہیں، جِلد کی طرح، کھال کی طرح۔ لباس کو اُتارنا ممکن ہوتا ہے مگر کھال کو اُتارنا مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔ آج کی بزم آرائی کو اُن کی یاد کی تقریب کہنا مناسب ہوگا۔

سامعین کرام! پروفیسر ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی جیسے لوگ یعنی بڑے انسان زمان و مکان کی پابندیوں سے بالا تر ہوتے ہیں۔ ہر عہد اُن کا عہد ہوتا ہے۔ ایسے قابل ذکر اور قابل قدر نفوس آئے، وہ ہمیشہ وسیع کائناتی عظیم تخیّل کے مطابق کام کرتے رہے۔ آج ہر زمانہ اُن کا اپنا زمانہ ہے۔ کوئی زمانہ اُن کے ذکر سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ زمانے میں نہیں ہوتے مگر اُن کا نام زمانے میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اور اُن کے اسلاف کا سفرِ حیات سپاہ کی تیغ بازی سے لے کر نگاہ کی تیغ بازی تک پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے سامنے اُن کی فتوحات کا زمانہ حافظ محمود شیرانی کی علمی و ادبی خدمات کا زمانہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ حافظ صاحب نے تحقیق کا میدان سجایا تو اُن کے بیٹے نے تخلیق کے دربار میں اپنے جوہر دِکھائے۔

اُردو ادب کے چمن میں اختر رنگیں بیاں، گلوں کے ہم نشین اور صبا کے راز دان سے کون واقف نہیں؟ اُن کی غزل کے مصرعے ''تو جانِ آرزو ہے، تو ایمانِ آرزو'' کی دل کشی دامن دل میں اُترتی جاتی ہے۔ اختر صاحب محبت اور رومان کے شاعر ہیں محبت دنیا کی پاکیزہ ترین چیز ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر دنیا میں کوئی چیز آسمانی ہے تو وہ محبت ہے۔ اُن کے ہاں وطن بھی محبوبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُن کے نعتیہ اشعار پاکیزہ محبت کے نادر نمونے ہیں۔ اُن کے بقول:

محبت کے لیے آیا ہوں میں دنیا کی محفل میں
محبت خون بن کے لہلہاتی ہے مرے دل میں

جنابِ صدر! آپ خوب جانتے ہیں کہ اختر شیرانی نے بڑا کام کیا۔ بہت سرمایہ چھوڑا۔ لیکن کم عمر پائی۔ 43 سال کی عمر۔ علی شریعتی ایران کے نظریہ ساز دانش ور کی طرح۔ انگریزی شاعر کیٹس Keats کی طرح۔ مگر ان لوگوں کی زندگی جاودانی ہوتی ہے۔ کسی دانشور نے خوب کہا: ''مگر ایک قبیلۂ جاوِداں ایسے لوگوں کا بھی ہوتا ہے جو بعد از مرگ بھی لوگوں کے کام بناتے رہتے ہیں۔ آج کی محفل اِس بات کی روشن دلیل ہے۔

خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاسِ

اختر صاحب 1948ء میں داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ تب مظہر محمود شیرانی کی عمر 13 سال سے ایک ماہ کم ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے جس سے بڑا کام لینا ہوتا ہے اُسے یتیمی کے دن بھی دیکھنا ہی پڑتے ہیں۔ ہر بڑی شخصیت اور یتیمی کا بڑا گہرا ربط معلوم ہوت ہے۔ اب اُنھیں علمی وراثت کا بے پایاں سرمایہ ملا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری کا کام بھی۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے اِس قومی اور علمی ورثہ کی حفاظت کے کام کو خوب نبھایا، سنوارا اور بڑھایا بھی۔ پھول دار پودے پھول ہی پیدا کرتے ہیں۔ جب بنیاد اِس قدر مضبوط ہوگی تو عمارت کا رنگ و روپ دیدنی ہوگا۔ یہ حسن آج اپنی کرشمہ سازی دِکھا رہا ہے اور بین الاقوامی شہرت کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں جس کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ آپ کے خاندان میں فخر کا اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے کام کی فہرست بہت طویل ہے۔ مقالاتِ حافظ محمود شیرانی کی دس جلدیں، اُن کی علمی و ادبی خدمات کی دو جلدیں جو اِبن خلدون کی دس جلدوں پر مشتمل تاریخ اور دو جلدوں پر مقدمہ کی یاد دلاتی ہیں۔ اُن کے کام کی تفصیلات چھپ چکی ہیں۔ قارئین اس سے استفادہ کریں۔

جنابِ صدر! ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کے علمی مظاہر کی بات تو کوئی اہلِ علم ہی کرے گا۔

مجھے تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ حافظ صاحب کا علمی کمال اور اختر شیرانی کے شاعرانہ جوہر کی حلاوت اُن کی تصانیف میں جمع ہوگئی ہے ۔زبان پر کمال کی دسترس حاصل ہے ۔ بیان کے اظہار میں اعلیٰ درجے کی قُدرت اور قدرت بھی ۔

کہتے ہیں جہاں ہمدان شہر کی خصوصیت کا سبب بوعلی سینا اور باباطاہر عُریاں ہیں، وہاں کوہِ الوند کے دامن میں آباد شہر کا محلّ وقوع کچھ ایسا ہے کہ ایران کے مختلف حصوں سے جو شاہراہیں نکلتی ہیں وہ یہاں آ کر مل جاتی ہیں ۔ایسے اُردو زبان وادب کے تینوں افق تخلیق ،تنقید اور تحقیق کے علاوہ تعلیم وتدریس ،تصنیف وتالیف کے سوتے چاروں طرح اس خاندان سے جا ملتے ہیں ۔ٹھیک کہتے ہیں کہ مومن آفاق میں گم نہیں ہوتا بلکہ آفاق اُس میں گم ہو جاتے ہیں ۔ڈاکٹر صاحب کا علمی وادبی کام تو بے شک بہت زیادہ ہے ۔وہ کام اُنھوں نے بڑی عرق ریزی سے نبھایا ہے، مگر میں آج اُن کے خاکوں کی تین کتب پر مختصر بات کرنے کی جسارت کر رہا ہوں ۔ آپ کی کتاب ’’بے نشانوں کا نشان‘‘ عام انسانوں کی زندگیوں کا گلدستہ ہے ۔جس میں نو خاکے ہیں ۔ یہ کتاب 2006ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی ۔ڈاکٹر صاحب نے ان معمولی آدمیوں کو غیر معمولی بنادیا ہے ۔صداقت صداقت ہی ہوتی ہے ۔بلکہ خاص وعام کے امتیاز سے بالا تر ۔

یہ خاکے مولوی عبدالحق کے ’’نام دیو مالی‘‘، ’’گُدڑی کا لال‘‘ اور ’’نور خاں سپاہی اور رشید احمد صدیقی کے ’’کندن‘‘ اور ’’ایوب عباسی‘‘ کی یاد تازہ کرتے ہیں ۔ جیسے مولوی عبدالحق نے ’’نام دیو مالی‘‘ اور رشید احمد صدیقی نے ’’کندن‘‘ اور ’’ایوب عباسی‘‘ کو امر کر دیا ویسے ہی ڈاکٹر صاحب نے ان بے نام افراد کو بھی ناموری بھی دی اور امر بھی کر دیا۔ان خاکوں کی زبان لطافت اور شگفتگی سے بھر پور ہے ۔ یہی ان کے فن کا خلوص ہے جو تا ابد زندہ رہے گا۔کہا جاتا ہے کہ رومانوی شاعر ولیم ورڈز ورتھ (William Wordsworth) معمولی اشیاء میں غیر معمولی پن پیدا کر دیتا ہے ۔

"To the Cuckoo" اور "Daffodills" وغیرہ کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے ۔ڈاکٹر صاحب نے بھی ’’بے نشانوں کا نشان‘‘ میں یہ کام کر دکھایا ہے ۔

بادِ صبا کی موج سے نشو ونمائے خار و خس
میرے نفس کی موج سے نشو ونمائے آرزو

خاکوں کا دوسرا مجموعہ ''کہاں سے لاؤں اُنھیں'' 2011ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ یہ مجموعہ 12 خاکوں پر مشتمل ہے جو اہلِ علم کے متعلق ہے۔ یہ تمام احباب علم وعرفان کے پیکر اور زبان وادب کے درخشندہ ستارے رہے، جن کی خدمات اور کمالات سے کتب بھری پڑی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی نادری ملاحظہ ہو کہ اُنھیں اُن کے نیاز بھی حاصل رہے۔ یہ اِدھر عوام میں شامل ہیں اور اُدھر خواص میں معتبر۔ عجیب سیرت پائی ہے کہ خاصان کی بارگاہ میں نمایاں اور عوام کے جھرمٹ میں بھی مقبول، بلکہ اُس درویش کی طرح جو کہتا تھا کہ میں دن کو زمین پر چلتا ہوں اور رات کو خاک پر سوتا ہوں مگر میرا تخیّل سیرِ فلک کی کرتا ہے۔ مجھے بھی اس بات پر فخر ہے میری بھی اُن سے صحبت رہی۔ اپنی اہلیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ اُن کی فیاضی اور محبت کے طفیل۔ بے شک بلبل کو خوش ہونا چاہیے کہ اُس کا قافیہ گل سے ملتا ہے۔

آپ کے مضامین کا تیسرا مجموعہ ''جانے کہاں بکھر گئے'' 2017ء میں سامنے آیا جو 17 مضامین پر مشتمل ہے۔ اِس میں کچھ تنقیدی مضامین بھی ہیں۔ یہ موقع بہ موقع لکھے گئے خاکہ جات اور مضامین ہیں۔ اس میں کالج ہٰذا کی تاریخ بھی ہے اور تفسیر بھی۔ ان خاکوں میں ڈاکٹر صاحب کی شائستگی اور شگفتگی کے جوہر خوب کھلے ہیں۔ ان کا علمی پایہ بھی بے پایاں ہے۔ اُن کا کلام لا کلام، اُن کی دانش لاجواب، اُن کا رویہ با کمال ہے۔ لفظ لفظ قابلِ داد، ہر سطر بااعتبار حُسنِ بیاں کا نگارخانہ ہے۔

دیکھو تو دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

☆☆☆☆☆☆

معاشرتی بگاڑ کا ذمہ دار کون؟

جنابِ صدر! معز ز سامعین! پیشتر از یں کہ سلسلۂ سخن شروع کروں مجھے آپ کے سامنے اظہارِ خیال کرتے ہوئے تنگیِ داماں کا احساس ہے ۔ بقولِ اقبال:

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات

جنابِ صدر! آج جو موضوعِ سخن ''معاشرتی بگاڑ کا ذمہ دار کون؟'' زیرِ بحث ہے، انتہائی صاف اور عیاں ہے ۔ یوں تو ہر طبقۂ فکر اپنا دامن چھڑانے کے لیے دوسرے طبقے کو موردِ الزام ٹھہرائے گا .... عوام حکومت کو اس کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے .... حکومت کو عوام کی ناخواندگی اور بے عملی کا گلہ ہوگا .... اِدارے حکومت کی عدم توجہ کا ذکر کریں گے اور حکومت اِداروں کی ناقص کارکردگی پر چراغ پا ہوگی ۔ سیاست کے ایوانوں کے شہ سوار............ فوج کے سپہ سالاروں کو موردِ الزام ٹھہرائیں گے اور پاک فوج کے جرنیل سیاست دانوں پر کیچڑ اُچھالیں گے ۔ غرض جتنے منہ اُتنی باتیں ۔ شاہ احمد نورانی مرحوم کہا کرتے تھے کہ تبدیلی اوپر سے آئے گی تو معاملہ درست ہوگا ۔ وہ مثال دے کر سمجھایا کرتے تھے کہ اگر چھت صاف ستھری اور پاکیزہ ہوگی تو بارش کی صورت میں نیچے صاف پانی ہی آئے گا ۔ بصورت دیگر بارش کا صاف پانی غلاظت ساتھ لے کر آئے گا اور خود گندا ہو جائے گا ۔

بات بھی واضح طور پر سمجھ میں آنے والی ہے کہ اگر حاکمِ وقت درست اور خدا ترس ہوں تو عوام کو درست کر کے راہِ راست پر لانا آسان ہو جاتا ہے ۔ غریب کچی آبادیوں کے مکین، سندھ کے ہاری، پنجاب کے مزارعین، چھ ہزار روپے تنخواہ لے کر زندگی کے شب و روز بسر کرنیوالے جو زبانِ حال سے فریاد کر رہے ہوں:

تری دنیا میں یارب صبر سے ہم نے بسر کر لی
تری دنیا سے بھی بڑھ کر ترے دوزخ میں کیا ہوگا

یا

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا خرابی اور کیا بربادی کریں گے۔

جنابِ صدر! ممکن ہے بلکہ یقینی طور پر کچھ مقررین ہمارے نظامِ تعلیم کو یا اہلِ مدرسہ کو خرابی کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے اقبال کا یہ شعر پیش کریں:

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ اِلاَّ اللہ

تو یاد رہے کہ انگریزوں نے اپنی آمد کے ساتھ ہی یہاں کا نظامِ تعلیم تبدیل کیا اور اہلِ ہند کی خودی کو تعلیم کے تیزاب میں ڈال کر ایسا ملائم کیا کہ جدھر چاہا اُدھر پھیر لیا۔ انگریز چلے گئے مگر اُن کی باقیات اور نظامِ تعلیم جوں کا توں اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کے اضافے کے ساتھ قائم ہے اور دائم رہنے کے امکانات موجود ہیں۔

جنابِ صدر! یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ قومی ترقی مجموعہ ہے، شخصی محنت، شخصی عزت، شخصی ایمان داری اور شخصی ہمدردی کا .... یہ بھی درست ہے کہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدّر کا ستارہ

افراد سے مل کر ادارے بنتے ہیں اور اداروں کے ملاپ سے حکومتیں ...... افراد کی تربیت کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ ذمہ داری بھی حکومت کی ہے۔ فطرت افراد کے گناہوں سے تو اغماض کر لیتی ہے مگر ملت کے گناہوں کو معاف نہیں کرتی۔

جنابِ صدر! ہماری بدنصیبی اور بگاڑ کا ایک پہلو یہ بھی ہے .... ہماری سیاسی تربیت نہیں ہوئی۔ جو زمانہ بادشاہت سے جمہوریت کے سفر کا تھا وہ ہم نے غلامی میں بسر کر لیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد سیاست کے ایوانوں میں وہ کھلبلی مچی کہ الامان والحفیظ ۔ پاکستان کا پہلا آئین 1956ء میں بنا اور 1958ء میں شکست وریخت کا شکار ہوگیا .... 1962ء کا آئین ایک اور مارشل لاء کے ہاتھوں بکھر بکھر گیا .... 1973ء کا آئین موجود ہے مگر یہ بھی دو مارشل لاء دیکھ چکا ہے .... وہ ملک جو قائدِ اعظم کے چودہ نکات کی روشنی میں حاصل کیا تھا، مجیب الرّحمن کے چھ نکات کی تاریکی میں آدھا رہ گیا .... اسے ہماری بدنصیبی کہیے کہ وہ ملک جس کا مینار ہم نے 1968ء میں تعمیر کرنا شروع کیا اور 1973ء میں مکمل کیا وہ مینار کی تکمیل سے قبل ہی دولخت ہوگیا .... اِس میں کون شامل ہے؟

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

کے مصداق ''کس کے گھر جائے گا طوفانِ بلا میرے بعد'' پتا نہیں چل رہا معاشرتی بگاڑ کا ذمہ دار کون؟

جنابِ صدر! آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نظامِ تعلیم کے بگاڑ کی بات نہیں کر رہا .... اپنے اساتذہ کی کم کوشی و بے ذوقی کا ذکر نہیں کر رہا .... میں اپنے واعظین کا دفاع کر رہا ہوں .... میں وطن عزیز کے مراعات یافتہ طبقہ کی بات نہیں کر رہا جو سرگونہ نظامِ تعلیم کو چلا رہے ہیں ۔ آپ یہ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ میں توہین عدالت کے خوف سے آزاد عدلیہ کی بات نہیں کر رہا .... میں انتظامیہ کی بات نہیں کر رہا کہیں وہ مجھے رسوا نہ کریں .... جناب میں پٹواری اور محکمہ مال کی بات نہیں کر رہا جن کے سب سے زیادہ مکانات شہر میں تعمیر ہیں ۔

میں نے اُن سیاست دانوں، پاک فوج کے اُن جرنیلوں، بیوروکریسی اور تاجروں کی بات نہیں کر رہا جن کے اربوں کے اثاثہ جات بیرون ملک ہیں ۔ میں تو نہ کہہ سکا ۔ ضبطِ سخن میں اسیر رہا مگر شاعر کہہ گیا ہے :

تا حدِ نظر شعلے ہی شعلے ہیں چمن میں

پھولوں کے نگہبان سے کچھ بھول ہوئی ہے
جس عہد میں لُٹ جائے فقیروں کی کمائی
اُس عہد کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

لیکن صاحب اِن سب کا قبلہ درست کرنا کس کی ذمہ داری ہے ....؟

جنابِ صدر! آخری بات کہہ کر اجازت چاہوں گا کہ حاکمِ وقت اگر نیک نیتی سے یہ معاملات درست کرنا چاہیں گے تو نصرتِ خداوندی اُن کے شامل حال ہوگی۔ اگر وہ سنتِ عمرؓ کی پاسداری کر کے اپنی ضروریات میں تخفیف کرلیں اور حضرت علیؓ کی طرح غریبوں کو اپنے رزق میں شامل کرلیں تو مستقبل یقیناً ان کا ہوگا۔ بے شک خدا اُن کی حالت بدلتا ہے جو اپنی حالت آپ بدلنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ پیغام ہمارے سامنے ہے:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے دہر میں اِسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

آئیے عہد کریں ....!

خونِ دل دے کے نکھاریں گے رخِ برگِ گلاب
ہم نے گلشن کے تحفّظ کی قسم کھائی ہے

جنابِ صدر! جب پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ کے ایک حکم پر نقل مافیہ ختم ہوسکتا ہے، پورے پنجاب میں دو روپے کی روٹی میسر آسکتی ہے .... تو بگاڑ میں سنوار کی صورت پیدا کیوں نہیں ہوسکتی؟

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

☆☆☆☆☆☆

کمپیوٹر کا جہاں اور ہے تختی کا جہاں اور

صدرِ ذی وقار! اور سامعین کرام!

جنابِ صدر! ''کمپیوٹر کا جہاں اور ہے تختی کا جہاں اور''

یہ موضوع دراصل علامہ اقبال کے اشعار کی پیروڈی ہے۔ اصل اشعار یوں ہیں:

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

دراصل عنوان بالا دو روّیوں (قدیم اور جدید کے، ماضی اور حال کے، روایت اور رومان کے) کی طرف اشارہ ہے۔ ''تختی کا جہاں'' ماضی کے انداز کا آئینہ دار ہے۔ ''قدیم روایات کا پاسدار ہے۔'' لوح وقلم کا تصوّر اِرتقائے انسانی کے لیے ضروری ہے، تہذیبِ انسانی کی بنیادی کڑی ہے۔ مذاہبِ عالم کا تصوّر لوح وقلم کے ساتھ وابستہ ہے۔ لیکن اِس کے برعکس کمپیوٹر تختی کی فروغ یافتہ شکل ہے۔ کمپیوٹر صرف تحریر کی ہی نہیں بلکہ علوم کے ازخود فروغ کا آئینہ دار بھی ہے۔ آنِ واحد میں آپ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا، تاریخِ انسانی کے مختلف موڑ، تمام جامعات کی ویب سائٹس، افراد کے ای میل ایڈریس، مختلف خطوں کے نمونہ جات اور رنگا رنگ تصویری پیکر کمپیوٹر کو جاری کر کے دیکھ، پڑھ اور لکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل درست ہوگا:

کمپیوٹر کا جہاں اور ہے تختی کا جہاں اور

جنابِ صدر! آج کا عہد سائنس اور ٹیکنالوجی کا عہد ہے۔ دنیا گلوبل ولیج کی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔ کسی ایک جگہ کا واقعہ .... خاص اُس جگہ کا واقعہ نہیں .... بلکہ

پوری دنیا اس سے متأثر بھی ہوتی ہے اور اسے قبول بھی کرنا پڑتا ہے۔گھنٹوں کی مسافتیں لمحوں میں بدل چکی ہیں مہینوں کا سفر .... گھنٹوں میں سمٹ آیا ہے۔دوری کا تصوّر مفقود ہو چکا ہے۔ اِس جہانِ تگ و دو نے نیا رنگ، نیا افق، نیا چلن اختیار کر لیا ہے۔اس میں تخنتی کے جہاں سے وابستگی کہاں کی دانش مندی ہے۔

آئین نو سے ڈرنا ، طرزِ کُہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

جنابِ صدر! اِس عالم رنگ و بُو کی ہر چیز رواں دواں ہے۔ہر طرف ترقی کا سفر پیشِ نظر ہے۔

ہر شے پر تغیر ِ نو کا فسوں طاری ہے
موسم پر بدلنے کی دھن طاری ہے

عہدِ نَو کے تقاضوں کے پیشِ نظر کمپیوٹر کے جہاں کو اپنانے اور تسخیر کرنے کی ضرورت ہے۔اقبال نے یہ خواب سچ ہی دیکھا تھا:

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

جبریل کو صیدِ زبوں کرنے کے لیے عہدِ نو کے تقاضوں کو اپنانا ہوگا اور واقعی امر پر اتفاق کرنا ہوگا:۔

کمپیوٹر کا جہاں اور ہے تختی کا جہاں اور

جنابِ صدر! مستقبل کھلا امکان ہے۔تزکیۂ نفس کے بعد ہی تسخیرِ فطرت کا مرحلہ ہے۔ قوموں کی تقدیر صدیوں کے ارتقائی عمل سے وابستہ ہے۔وہ قومیں جو عظمتِ رفتہ کے حصار میں گم مستقبل کی تابناکیوں سے صرفِ نظر کرتی ہیں، بلکہ حال مست قومیں پسپا ہی ہوتی ہیں اور رسوا بھی .... اگر ہم نے زمانے کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھنا ہے،ترقی کے ثمر سے بار آور ہونا ہے

.... اپنی عظمتِ رفتہ کو، اپنے کھوئے ہوئے نشیمن کو، اپنے قابل فخر ماضی کو ...... اپنے حال اور مستقبل میں سمونا ہے تو ہمیں ''تختی'' کے جہاں کو چھوڑ، کمپیوٹر کے جہاں کو اپنانا ہوگا۔

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی

دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

جنابِ صدر! آخری بات کہہ کر اجازت چاہوں گی۔

عہد کے بدلتے تقاضوں کا ساتھ دینا ضروری ہوتا ہے۔شب و روز کبھی ایک سے نہیں رہتے .... ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن .... كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ............ لٰہذا ہر جدت کو بدعت کہہ کر ٹھکرانے والے اِس دنیا کے نہیں کسی اور جہاں کے رہنے والے ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

نیوکلیئر ٹیکنالوجی ترقی کی ضامن ہے

انداز ِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات

جنابِ صدر! آج کا موضوعِ سخن، افکار کی دنیا سے اُتر کر اِظہارِ خیال کی دنیا میں رگِ حیات بن رہا ہے: ''نیوکلیئر ٹیکنالوجی ترقی کی ضامن ہے'' عنوان ہی انسانیت کے ساتھ مذاق ہے۔ آج کے اِس پُر وقار ایوان میں لوگ انسانی خوش حالی، تیز رفتار ترقی کی باتیں کر رہے ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ انسان جل رہا ہے، انسان مر رہا ہے، تہذیب سلگ رہی ہے، مردم شماری کو بے شمار اور مردم شناسی کو کم یاب، جہاں زندگی ...... درندگی بن جائے، جہاں تہذیب ...... وحشت میں اور ثقافت بربریت میں ڈھل جائے وہاں ترقی اور مادی فتوحات کیا معنی رکھتے ہیں۔ اقبال نے کیا خوب کہا تھا:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

جنابِ صدر! بے شک نیوکلیئر ٹیکنالوجی سے انسان نے پرندوں کی طرح ہواؤں میں اُڑنا سیکھ لیا ہے۔ اس نے مچھلیوں کی طرح دریاؤں میں تیرنا بھی سیکھ لیا ہے، مگر انسانوں کی طرح زمین پر رہنا نہیں سیکھا۔ جہاں دولت کا سیلاب ہو مگر قناعت نایاب، جہاں دن ہوا و ہوس میں اور رات ناؤ نوش میں گزرے، جہاں علم دوستی دریا بُرد، ہوش و خرد مئے ناب میں غرق:

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنّا کہ نہ دنیا ہے نہ دین

تو کس طرح دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ''نیوکلیئر ٹیکنالوجی ترقی کی ضامن ہے۔''

جنابِ صدر! آج کے موضوع پر مجھے رہ رہ کر حیرت ہو رہی ہے۔ اس کے حق میں دلیل دینے سے انسانی خوشحالی، اشیاء کی افراط اور بہتات کی بات تو کرتے ہیں، سہولیات اور آسائشات کی کثرت کا راگ الاپتے ہیں۔ انسان کے تن کے اُجلے پن پر زور دینے والے انسان کے من کی تاریکی کو کیوں بھول گئے ہیں؟ خوشحالی کے اِس عہد میں یہ بے چینی، خوف اور اضطراب کیسا؟ ایجادات کی کثرت کے ہجوم میں یہ انسانی مسائل، فسادات، جھگڑے، بدامنی اور خوں ریزی کیسی؟ عالم گیر جنگوں کے سلسلے، لیگ آف نیشنز کی ناکامی اور اقوامِ متحدہ کی بے بسی اور لاچاری کے کیا معنی؟

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

معزز سامعین! قحط الرّجال کے عہد میں ترقی کے سفر کی داستان بے معنی ہو جاتی ہے۔ اگر آپ نے نیوکلیر ٹیکنالوجی کی تباہ کاری کا اندازہ کرنا ہو تو مجھے ماضی کے دریچوں میں جھانک کر جاپان کے ہنستے کھیلتے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی سے پوچھنا ہوگا کہ اِس ٹیکنالوجی نے اُن پر کیا قیامت ڈھائی تھی؟ جہاں آج تک معذور نسلیں جنم لے رہی ہیں۔ سمندر کے پانی کے کھولاؤ، ان گنت انسانوں کے قبرستان کی کہانی سب کو یاد ہے۔ اگر اِس ترقی کی ہولناکی کا اندازہ کرنا ہو تو ملتان کے خونی حادثے، مون مارکیٹ لاہور کے دل دوز منظر پر نگاہ ڈالو۔ ایک ہی دن میں لاہور، کوئٹہ اور پشاور کے خونی مناظر تہذیب و ثقافت کے دعویٰ کے منہ پر طمانچے ہیں۔ ایک گھر سے اُٹھنے والے باپ، دادا اور بیٹے کے جنازے، مون مارکیٹ میں ایک گھر کے چار جنازے تہذیب کے دعویداروں کا تمسخر اُڑا رہے ہیں۔

انسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر   دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

جنابِ صدر! میرے ساتھی مُصر ہیں کہ عہدِ حاضر تہذیب وثقافت اور روشنیوں کا عہد ہے:۔علومِ طب، فنون وعلوم کے سرچشمے پھوٹ رہے ہیں۔مگر انھیں معلوم نہیں کہ یہاں ہوسِ زر کے پجاری جنم لے رہے ہیں۔جوع الارض عام اور ارزاں ہوگئی ہے۔عراقی تباہی، افغانستان کی بربادی، وزیرستان میں اغیار کی سازشیں، وِیت نام کی دھواں دھواں تاریخ۔پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریاں انسانی تہذیب کا منہ چڑا رہی ہیں۔آج کی تازہ ترین خبر نے تو مجھے حیرت میں ڈال دیا کہ بارک حسین اوباما کو امن کا نوبل پرائز دیا گیا ہے۔ادھر افغانستان میں تیس ہزار فوج کا اضافہ اور دوسری طرف نوبل پرائز کا حصول کس قدر حیران کُن واقعہ ہے۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

جنابِ صدر! آخری بات کہہ کر اجازت چاہوں گا۔ترقی کے تمام راز، علوم وفنون کی تمام ترقی فضائے بسیط کی پہنائیوں کا سفر، دریا کی گہرائیوں کی تحقیق وتدقیق،، سائنسی ایجادات کا حصول! انسان کی حُرمت، اطاعت کے گرد گھومے تو اس کا قبلہ درست اور عمل باوضو ہے۔اگر اِن ایجادات نے انسان کو (جو کائنات کی بارات کا دلہا ہے) نکال دیا تو یہ ساری کہانی محض فریبِ نظر لگتی ہے۔ یہ ایک سراب ہے، ایک خواب ہے جس کی تعبیر لہو رنگ ہے، جس کی زمین سرخ ہے، جس سے انسانیت سسک اور بلک رہی ہوگی۔پھر کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ:"نیوکلیر ٹیکنالوجی ترقی کی ضامن ہے۔"

بہتر ہے مہ و مہر پہ ڈالو نہ کمندیں
انساں کی خبر لو کہ وہ دم توڑ رہا ہے

☆☆☆☆☆☆

امن میں سلامتی ہے

جنابِ صدر! اساتذہ گرامی قدر! ہم مکتب ساتھیو!

آج کا زیرِ بحث عنوان ''امن میں سلامتی ہے'' ایک دعوتِ فکر بھی ہے اور دعوتِ عمل بھی۔ اِس میں قوموں کی سربلندی کا راز بھی ہے .... اور انسانیت کے درد کا مداوا بھی سازِ ہستی کے لیے نغمہ راحت بھی ہے اور اقوامِ عالم کے لیے سامانِ فرحت بھی۔ مگر دنیا آج حالتِ امن میں نہیں بلکہ حالتِ جنگ میں ہے۔............ کہیں فرقہ واریت کے شعلے بھڑک اُٹھے ہیں اور کہیں انتقام کی آگ .... کہیں تہذیبی تصادم کی یلغار ہے اور کہیں جوع الارض کا نشہ .... کہیں اوروں کے وسائل پر قبضہ کرنے کا جنوں .... اور کہیں ہوس پرستی کے گہرے سائے۔ یہ حالات دیکھ کر یہ شعر زبان پر جاری ہو جاتا ہے:

سازِ ہستی سے نکلتے ہیں سسکتے نغمے
مطربِ دہر کی بے کیفیِ نغمات نہ پوچھ

جنابِ صدر! جب انسان سایوں میں ڈھل چکے ہوں، اقدار رخصت ہو چکی ہوں، ایمان کو دنیا کے بعد دوسرا تیسرا درجہ حاصل ہو تو امن کیسا اور سلامتی کے کیا معنی؟ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ وجہِ انتشار اور علاج دونوں کو ایک ہی شعر میں بیان کر دیا ہے۔

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو ''سبب''
اخوّت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا ''علاج''

گویا سلامتی اخوت میں اور محبت امن میں موجود ہے۔

آئیں ایک اور زاویے سے دیکھتے ہیں:۔

آج دنیا میں کیا کچھ نہیں ہے، بہترین خوراک ہے۔ حسین ترین پوشاک ہے۔ سیر کے

لیے وادیِ گُل فام ہے۔سواری کے لیے کار ہے،طیارے ہیں۔مشینوں کی جھنکار نے اشیاء کی فراوانی کے انبار لگا دیے ہیں۔ہر طرح کی مادی سہولت،ہر نوع کی راحت،وسائل کی کثرت،اشیاء کی بہتات مگر سکون کا فقدان!سلامتی ناپید!زندگی اجیرن!خوف کا احساس ہر لمحہ بڑھتا جا رہا ہے۔

سکوں درکار ہے لیکن سکوں حاصل نہیں ہوتا
جو ٹھہرا دے ذرا دل کو وہ دردِ دل نہیں ہوتا

امن کا متضاد جنگ ہے۔جنگیں تہذیبوں کو مٹا دیتی ہیں۔چمکتے اور ہنستے بستے شہروں کو برباد کر دیتی ہیں۔

جنابِ صدر!''امن میں ہی سلامتی ہے۔''اِسی میں قوموں کی فلاح اور بقا کا راز پوشیدہ ہے۔اور امن من کی چِنتا دور کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔آج کے انسان کی شخصیت میں فشار ہے۔یہی وجہ ہے کہ سکون اور سلامتی کا فقدان ہے۔ایک اہم نکتہ:امن''ایمان'' کا مادہ ہے۔سلامتی اور سکون اس کا تقاضا ہے۔اہلِ ایمان صرف سکون اور سلامتی کی دولت عام کرتے ہیں۔مومن امن کا پیامبر اور مسلمان سلامتی کا علمبردار۔مسلمان کی پہچان!اُس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ ہو تو وہ مسلمان ہے،ورنہ اُسے اپنے کردار اور عمل پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے ....
اسلام جنگ میں سلامتی کے امور کو پیش کرتا ہے .... ''عورتوں کو قتل مت کرنا .... بچوں کو نہ مارنا .... پھل دار درختوں کو مت کاٹنا۔''

پھر کیوں نہ کہوں!

''امن کی برکھا میں ہی سلامتی کا راز مضمر ہے۔
دامن دل کو دین سے وابستہ کر کے مراد پائیں گے یقیناً۔۔۔

☆☆☆☆☆☆

ہے علم رختِ سفرِ میرِ کارواں کے لیے

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی علیٰ رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

جنابِ صدر، معزز سامعین، حاضرین و ناظرین! مجھے آج کے اِس پُر وقار ایوان میں اِظہارِ خیال کرتے ہوئے تنگیِ داماں کا احساس ہو رہا ہے۔ میں بقول اقبالؒ:

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مِری بات

جنابِ صدر! آج کا موضوعِ سخن جو افکار کی دنیا سے نکل کر اظہار کی دنیا کی زینت بن رہا ہے، اُسے اگر الفاظ کے موتیوں کی لڑیوں میں پرو یا جائے تو سلسلۂ سخن کچھ یوں بنتا ہے:

''ہے علم رختِ سفرِ میرِ کارواں کے لیے۔'' بڑی اہمیت کا حامل عنوان ہے۔ اقبالؒ نے خوب کہا تھا:

نِگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفرِ میرِ کارواں کے لیے

آج کے عنوان میں یہ بصیرت پوشیدہ ہے کہ علم کے بغیر نگاہ کی بلندی، سخن کی دل نوازی اور جان کی پُرسوزی ممکن نہیں ہے۔ علم انبیاء کی میراث ہے، علم نور ہے، آگہی اور اِدراک کا باعث ہے۔ اسماء و اشیاء کا شعور ہے۔ باغِ قدس میں جب ملائکہ خدا کے حضور جمع تھے تخلیق آدم اور نیابتِ آدم کی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا، فرشتے آدم کی خوں ریز صفت کی بات کر رہے تھے، رحمان علم کی فضیلت کے باعث نیابتِ اِلٰہی کا تاج آدم کے سر سجا رہا تھا۔ ''آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھا دیے'' جن سے فرشتے ناواقف اور نا آشنا تھے۔ ثابت ہوا کہ خالق کو جاننا، رازق کو پہچاننا، کائنات کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہونا، حیات و کائنات کے رموز دریافت کرنا، تسخیرِ فطرت، کوہ و صحرا، دشت و

جبل اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے کا علم انسان کو خالق حق نے عطا کر دیا تھا۔ یہی وہ شرف ہے جو انسان کو دیگر تمام مخلوقات ''حیوانات، نباتات، جمادات اور جنات وملائکہ'' سے ممتاز کرتا ہے! پھر کیوں نہ کہوں:

ہے علم رختِ سفر میر کارواں کے لیے

جنابِ صدر! خدائے عزّوجل نے انسانوں کی ہدایت کے لیے ایک لاکھ اور چوبیس ہزار کم وبیش پیغمبرانِ عظام کا سلسلہ مبعوث فرمایا۔ مناجاتِ نوحؑ، لحن داوٗدیؑ، اعجازِ مسیحاؑ، معجز طرازیِ موسیٰؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت داوٗدؑ کے بارے میں اِرشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ عِلْمًا ☆ سورۃ النمل ۲۷:۱۵

اور پھر حضرت لُوطؑ کے بارے میں اِرشاد ہے:

وَلُوْطًا اٰتَیْنٰهُ حُکْمًا وَّعِلْمًا ☆ سورۃ الانبیاء ۷۴:۵

اور حضرت یوسفؑ کے بارے میں اِرشاد فرمایا:

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ اٰتَیْنٰهُ حُکْمًا وَّعِلْمًا ★ وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ★

سورۃ یوسف ۲۲:۳

گویا جس جس پیغمبر کو بھی نبوت کے جلیل القدر مرتبہ پر فائز کیا اُسے علم وعرفان، حقیقت وآگہی کی دولت سے سرفراز فرمایا۔ بلکہ ختم الرّسل، مولائے کُل، دانائے سُبُل، وجہِ تخلیق کائنات، باعثِ تکوین کائنات اور عنوانِ بزمِ دو جہاں حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر وحی کا آغاز لفظ ''اِقرأ'' سے ہوتا ہے جو اِس بات کی بیّن دلیل ہے کہ امامتِ عالم کا دامن علم سے وابستہ ہے۔ بلکہ پیغمبرِ آخرالزّماں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اِرشاد ہوتا ہے:

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا۔ اے اللہ مجھے اور علم کی نعمت سے نواز۔

یہ کون کہہ رہا ہے:

جب حضرت موسیٰؑ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ، جن کے لیے اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ کا

مژدہ سنایا جارہا ہے: وہ کہہ رہے ہیں: رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا۔ ''مولا! میرے علم میں اضافہ فرما۔'' پھر کیوں نہ کہا جائے:۔

ہے علم رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

جنابِ صدر! کہتے ہیں کہ بہترین معاشرے کا نام اُمت ہے۔ اُمّت افراد کا ایسا گروہ ہے جس کا ایمان ایک اور ہدف مشترک ہے۔ ایسی اُمّت کے تین امتیازات ہوتے ہیں: کتاب، ترازو اور آہن۔ تینوں علامات ہیں، استعارے ہیں۔ کتاب سے مراد تمدّن، معرفت اور علم ہے۔ کتاب ہی ترازو یعنی عدل اور آہن یعنی قوت کو توازن اور رہنمائی عطا کرتی ہے۔ اگر کتاب نہ ہو یا کتاب سے صرفِ نظر کرلیا جائے تو ہوس اور نفس کے بُت ترازو کے پلڑوں میں عدم توازن پیدا کر دیتے ہیں۔ کتاب کی رہنمائی کے بغیر آہن وقوت بے لگام ہو کر کبھی ہیروشیما میں، کبھی ویت نام میں، کبھی فلسطین کے لالہ زاروں میں، کبھی جنت نظیر کرّہ ارض کشمیر کے مرغزاروں میں، کبھی دجلہ وفرات کی خوش نما وادیِ عراق میں اور کبھی افغانستان کے کوہساروں میں تباہی کا موجب بنتی ہیں۔ لہٰذا یہ بات اظہر مِنَ الشّمس ہے کہ

ہے علم رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

جنابِ صدر! جب تک اُمّتِ مسلمہ علم کے دامن سے وابستہ رہی، تہذیب وثقافت، جاہ و ثروت، دولت و اِقبال اُن کی میراث تھے۔ مسجدِ قرطبہ کے مینار، الحمرا کے کاخ وایوان، تاج محل آگرہ کا حُسن، بادشاہی مسجد کی سطوت، قطب مینار دہلی اُن کے قصیدہ خواں اور اُن کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ لیکن بقول اقبالؒ:

وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

یا بقول غنی کاشمیری:

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کُن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زُلیخا را

اب اپنی متاع اغیار کے قبضے میں دیکھ کر دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔

جنابِ صدر! ایک مغالطہ البتہ رفع کرتا چلوں:

علم کو نور بھی کہا گیا ہے اور حجابِ اکبر بھی۔ جس علم سے غرور پیدا ہو وہ حجاب ہے۔ جو علم نگاہ سے محروم ہو وہ بھی حجاب، جو تعلق سے گریزاں ہو علم حجاب، جو اپنی اَنا کے خول سے نہ نکلے وہ علم حجاب ہے۔ ابوجہل کے پاس علم تھا، نگاہ نہ تھی۔ اقبال نے اِسی علم کی درجہ بندی کی ہے:

خِرد کے پاس خبر کے سِوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

بقول رومیؒ:

علم را بر دل زنے یارے بود
علم را بر تن زنے مارے بود

مفہوم: ''جو علم قلب کی گہرائیوں میں اُترے دوست ہے، وفا ہے۔ علم جو روح کو ترک کرے اور مارے کی آسائش کی بات کرے سانپ ہے۔''

جنابِ صدر! میں اپنی بات کا اختتام واصف علی واصفؒ کے الفاظ پر ختم کرتا ہوں:

''علم اگر خود آگہی کے قریب کرے تو نور ورنہ حجاب۔ زیادہ جاننے کا غرور اگر نہ جاننے کی عاجزی میں بدل جائے تو حجاب اُٹھ جاتا ہے .... فنا کا علم حجاب ہے .... بقا کا علم نور۔ اگر علم کا مدعا خوشنودیِ خلق ہے تو حجاب، اگر علم کا منشا رضائے حق ہے تو نورٌ علیٰ نور۔ گویا جتنا علم زیادہ ہو گا اُتنا ہی احساسِ لاعلمی زیادہ ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ یونان کا فلسفی کہا کرتا تھا! ''میں بس اِتنا جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔''

☆☆☆☆☆☆

جی اُٹھی ہیں خواہشیں

جنابِ صدر! اور معزز سامعین پیشتر ازیں کہ میں سلسلۂ سخن شروع کروں مجھے اِس پُر وقار ایوان میں اِظہارِ خیال کرتے ہوئے تنگیِ داماں کا احساس ہو رہا ہے۔ میں بقول اقبالؒ:

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات

اپنی تنگ مائیگی کا اظہار کروں گی۔

جنابِ صدر! آج کا عنوان ''جی اُٹھی ہیں خواہشیں اور مر گیا ہے آدمی'' کس قدر حقیقت کا مظہر اور حقیقتِ حال کی تصویر ہے۔

موت سے کس کو مفر ہے، مگر انسانوں کو
پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے

بے شک انسان نے فضاؤں میں پرندوں کی طرح اُڑنا سیکھ لیا ہے .... دریاؤں میں مچھلیوں کی طرح تیرنا بھی سیکھ لیا ہے، لیکن زمین پر انسانوں کی طرح رہنا نہیں سیکھا۔ یہ سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرنے کا دعوے دار انسان .... اپنی زندگی کی شبِ تاریک کو سحر نہیں کر سکا .... تہذیبِ حاضر کی چکا چوند روشنی کا خالق ...... وادیِ گل و فام کا مسافر، بہترین خوراک جمع کرنے والا ...... حسین ترین پوشاک زیبِ تن کرنے والا ...... خاک کا پُتلا .... انسانوں کے دکھوں کا مداوا نہیں کر پا رہا ہے۔ وہ دہشت گردی کے خاتمے کی کوشش میں بھی دہشت گردی کا ارتکاب کرتا جا رہا ہے۔

درد سے معمور ہوتی جا رہی ہے کائنات
اِک دلِ انساں ہے کہ درد آشنا ہوتا نہیں

پھر کیوں نہ کہوں: ''جی اُٹھی ہیں خواہشیں اور مر رہا ہے آدمی۔''

اقدار دم توڑ رہی ہیں۔ انسانیت سسک رہی ہے۔ کشمیریوں کی آزادی کے خواب ادھورے ہیں۔ اُنھیں تعبیر نہیں مل رہی ہے اُنھیں منزل نہیں مل رہی۔ بین الاقوامی اِدارے مصلحتوں کا شکار ہیں۔

جنابِ صدر! عنوان زیرِ بحث نہایت حکمت افروز ہے۔ جس میں آج کے انسان کی اپنی منزل سے دُوری کا ماتم ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد تو

یہی ہے عبادت، یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

یا

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

تھا۔ مگر شب و روز کبھی ایک سے نہیں رہتے .... دیکھتے ہی دیکھتے آوے کا آوا بگڑ گیا۔ سب کچھ بدل گیا ...... سوچ ...... زندگی اور نظریں ......۔ صورتیں سایوں میں ڈھل گئیں، سائے اندھیروں میں ڈوب گئے .... بہت سے اچھے آدمی بھی اچھے نہ رہے۔ اور وہ اچھے آدمی جو بچ رہے تھے، وہ روپوش ہو گئے............ پھر کیوں نہ کہوں .... ''جی اُٹھی ہیں خواہشیں اور مر گیا ہے آدمی۔''

جنابِ صدر! کسی بڑے آدمی کا قول ہے: ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے آدمی انعام کے طور پر دیے اور سزا کے طور پر روک لیے جاتے ہیں .... عطا تو اُسی کے حق میں ہوتی ہے جو حق دار ہو۔ آخر قدرت ایک سپاس نا آشنا قوم کو بڑے آدمی کیوں عطا کرے .... اُسے اپنے عطیے کی رُسوائی ...... اور ناقدری ناگوار گزرتی ہے۔

ایک وہ دہائی تھی جو ۱۸۷۰ء سے شروع ہوئی .... اس دہائی میں بڑے

بڑے آدمی پیدا ہوئے۔ وہ دس برس بھی کیا منتخب سال تھے۔ اگر یورپ میں چرچل، لینن اور سٹالن پیدا ہوئے تو برِاعظم میں قائدِاعظمؒ، علامہ اقبال، محمد علی جوہر اور ظفر علی خان بھی انھی برسوں میں پیدا ہوئے۔

اس کے بعد مسلمانوں پر کیا اُفتاد پڑی کہ خواہشیں جی اُٹھیں .... ایک کارخانہ، پھر دوسرا کارخانہ۔ دیگر ممالک کی سیر۔ سفر کے لیے کار اور طیارے۔ رہنے کے لیے حسین ترین بنگلے .... صوفے افرنگی اور .... قالین ایرانی ...... اور آسائشات کی کثرت اور درد مندی کا فقدان۔

اس کے بعد نہ دیوانے پیدا ہوئے نہ فرزانے .... ہمارے حصے میں ایک ہجوم آیا ....سرگشتہ اور برگشتہ .... خواہشات کا پجاری، مراعات کا خواہاں ...... ڈالر کا طلب گار .... جاہ وحشم کا متلاشی .... آراستہ و پیراستہ مکانات کا داعی۔ غرضیکہ خواہشات اُس کے تعاقب میں اور وہ خواہشات کے تعاقب میں ہمہ دم سرگرداں۔

جنابِ صدر! ایسے عالم میں روح کو آسودگی، نظر کو کشادگی، انسان کو دلبری، قوم کو سیادت، ملت کو امامت، حکمت کو فرزانگی، انسان کو دردِ دِلی ...... ملے تو کیسے!! پھر تو شاعر کو بے ساختہ کہنا پڑا:

میٹھے تھے جن کے پھل وہ شجر کٹ کٹا گئے
ٹھنڈی تھی جس کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی
بول اے مِرے دیار کی سُونی ہوئی زمیں
میں جن کو ڈھونڈتا ہوں کہاں ہیں وہ آدمی

جنابِ صدر! آخری بات کہہ کر اجازت چاہوں گی:

یہاں ماتم قحط کا نہیں .... قحط الرّجال کا ہے۔ اِس عالم رنگ و بُو میں جہاں آٹھ ارب سے زائد آدمی بس رہے ہیں......''انسانم آرزو است'' کی تمنّا ہے۔ اِتنی مردم شماری کے

ہوتے ہوئے مردم شناسی کا فقدان .... خواہشیں اُٹھ رہی ہیں، اُبھر رہی ہیں ...... آدمی مر رہا ہے ۔ جناب مختار مسعود نے اسے نہایت خوب صورت پیرائے میں پیش کیا ہے: ’’قحط میں موت ارزاں ہوتی ہے اور قحط الرّ جال میں زندگی ۔ مرگِ انبوہ کا جشن ہو تو قحط، حیاتِ بے مصرف کا ماتم ہو تو قحط الرّ جال...... ایک عالم موت کی ناحق زحمت کا، دوسرا زندگی کی ناحق تہمت کا۔ ایک سماں حشر کا، دوسرا حشرات الارض کا .... زندگی کے تعاقب میں رہنے والے قحط سے زیادہ قحط الرّ جال کا غم کھاتے ہیں ۔‘‘

انسانیت کا جوہر علم سے کھلتا ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جنابِ صدر! سامعین کرام!

آج کا زیرِ بحث موضوع ''انسانیت کا جوہر علم سے کھلتا ہے'' ایک لاریب حقیقت ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اسلامی فکر سازی اور عملی ترغیب و تربیت میں دارِارقمؓ ،صفہ کی درس گاہ اور اصحابِ صُفّہ کا بنیادی کردار تھا۔عرب جس پر قرنوں سے جہل چھایا تھا، جہاں انسانیت اور اخلاقیات کا فقدان تھا۔تہذیب و تمدن سے نا آشنا قوم،شُتر بانوں کا گہوارہ علم کی بدولت تمدن آفریں اور خلاقِ آئین جہاں داری بنی۔تہذیب و تمدن اس کے شرمندۂ احسان ہیں۔ اِس تہذیب کا آغاز لفظ ''اِقرأ'' سے ہوا تھا یعنی پڑھ اپنے رب کے نام سے۔

جنابِ صدر! اگر تاریخ کی ایک لمبی چھلانگ لگا کر اسلامی تاریخِ ایران کے نامور بادشاہ الپ ارسلان اور ملک شاہ کے عہد کا مطالعہ کریں تو اُس عہد کا ایک نامور وزیرِ باتدبیر نظام الملک طوسی تھا۔اُس نے اکثر مقامات پر مدارس جاری کرائے۔ بغداد کا مدرسہ نظامیہ، جو حقیقت میں عالم اِسلام کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی، نظام الملک نے ہی قائم کیا تھا۔اُس نے ملک شاہ کے خط کے جواب میں بے ساختہ لکھا تھا کہ جس مالک نے آپ کو کلاہِ شاہی بخشی ہے اُس نے مجھے دوات عطا کی ہے۔'' آپ کی کلاہ اِس دوات سے وابستہ ہے۔'' اُسے کسی نے سوال کیا کہ آپ کے مدارس مکمل دفاع کیسے کریں گے؟ تو اُس نے جواب دیا تھا کہ یہ اپنے افکار کی قوت سے دنیا پر غالب آئیں گے۔ Their thoughts will be their errows.

جنابِ صدر! صرف یہی نہیں بلکہ برِّعظیم ہندو پاک کی آزادی اور تشکیل پاکستان کے لیے تعلیمی اِداروں کی مساعی سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں۔ دیوبند مدرسہ، ندوۃ العلماء، جامعہ ملیہ

اسلامیہ، سندھ مدرستہ الاسلام اور علی گڑھ کے نام سے کون شخص واقفِ حال نہیں۔ یہی وہ اِدارے تھے جنھوں نے آزادیِ وطن کے لیے فکر عطا کی۔ خوش قسمتی کی بات ہے کہ تشکیلِ پاکستان کا سہرا علی گڑھ کے سر بندھا۔ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بارے میں لوگوں نے رائے دی کہ یہ جامعہ قومیہ ہندیہ بن کر رہ گیا ہے۔ ندوہ کو قدامت کا مظہر سمجھا گیا لیکن فکر سازی، ملت کی بیداری، احساسِ زیاں اور حب الوطنی کے جذبات کے احیاء میں کسی نہ کسی طرح تمام مکاتب و مدارس کا حصہ نظر آتا ہے۔ کیسے کیسے نابغۂ روزگار تھے جو اِن مدارس سے اُبھرے اور آفاق پہ چھا گئے۔ یہ نتیجہ خیز کوششیں سیاسیات تک محدود نہ تھیں۔ علمی، ادبی، بلکہ مذہبی اور دینی معاملات میں بھی قوم نے نئی سر بلندیاں حاصل کیں۔ اُردو نثر کا آغاز، اُردو شاعری میں صحت مند انقلاب، فلسفہ میں بے مثل مفکر اور ان گنت شخصیات ان اداروں کی دین ہیں۔

جنابِ صدر! کہتے ہیں کہ جب روس نے خلائی سفر میں فتح حاصل کی اور خلائی اسٹیشن میر Mear قائم کر کے امریکہ پر سبقت لے گیا تو امریکہ نے فوراً اپنے تعلیمی اداروں کے طریقہ کار اور نصابِ تعلیم پر نظر ثانی کی۔ پھر زمانہ شاہد ہے کہ چاند کی تسخیر میں امریکہ روس پر بازی لے گیا۔ اُسے خوب معلوم تھا کہ تعلیمی اِدارے ہی یہ انقلابی عمل انجام دے سکتے ہیں۔ عقابی روح جب جوانوں میں بیدار ہوتی ہے تو وہ اپنی منزل آسمانوں میں تلاش کرتے ہیں۔

جنابِ صدر! ایران کے استاد مطہری کا قول ہے کہ ایران کے اسلامی انقلاب کا حاصل یہ ہے کہ ملت خود باختگی (بے یقینی) کی حالت سے خود یابی (یقین) کی منزل پہ پہنچ گئی۔ انقلاب کا راستہ متعین کرنے، ذہن سازی اور خیال اندیشی کے چار مینار نظر آتے ہیں۔ پہلا یورپ کا پڑھا ہوا معلمِ انقلاب (جو پہلے مشہد کے دیہاتی سکول، پھر فردرس نامی قصبے کے ہائی سکول اور بعد میں مشہد یونیورسٹی میں پروفیسر) تھا۔ دوسرا مطہری (دینی مدارس کا ذہین ترین فلسفہ باف) تیسرا بڑا اشتراکی ناول نگار اور چوتھا ایک مشہور ادیب جلال آلِ احمد جو پہلے اشتراکی تھا بعد میں اسلامی ہو گیا۔ اِس طرح ایرانی انقلاب کی صدا تعلیمی اِداروں سے اُٹھی تھی۔ یوں تو کہتے ہیں کہ بنگلہ دیش کی

علیحدگی میں ہندو بنگالی اساتذہ کا بڑا ہاتھ تھا۔اور بھی کئی سبب ہوں گے اور ہیں بھی۔لیکن نفرت کا بیج اُنھیں کا بویا ہوا تھا۔گویا تعلیمی ادارے ہی وہ سرمایہ ہیں جو قوموں کی تعمیر،فروغِ علم کی کوششوں میں بھر پور حصہ لے سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب انگریز ہندوستان پر غالب آئے تو اُنھوں نے سب سے پہلا حملہ ہمارے تعلیمی مراکز پر کیا۔ہماری خودی کو نئی تعلیم کے تیزاب میں ڈال کر جدھر چاہا موڑ لیا۔ ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے نے دعویٰ کیا تھا کہ میں آپ کو ایک ایسا نظامِ تعلیم دے رہا ہوں جسے اگر آپ جاری کر دیں تو سو برس بعد نہ ہندو، ہندو رہے گا اور نہ مسلمان، مسلمان!اور ایسا ہی ہوا۔انگریز چلے گئے مگر ”کالے انگریز“ قابض ہیں۔

جنابِ صدر!معاملہ سیاست کے خارزار کا ہو یا علم کے تحفظ و فروغ کا،بات خلائی سفر کی ہو یا سائنس کے میدان میں ترقی کی،سلسلہ آزادیِ وطن کا ہو یا دفاعِ ملت کا،ہر گام اور ہر قدم پر تعلیمی ادارے بھر پور کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب
یہ محبت کی حرارت، یہ تمنا کی نمود
فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب

دنیا کی تعمیر کا کام افکارِ تازہ سے ممکن ہے۔اور تعلیمی ادارے افکارِ تازہ کے سرچشمے ہیں۔جہاں باصلاحیت اساتذہ کرام کی مدد سے ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ بچوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتے ہیں۔ہم اپنی کشتِ ویران سے ناامید نہیں ہیں۔بے شک یہ تعلیمی اِدارے انسانیت کو ہلاکت و بربریت سے بچا سکتے ہیں۔فرقہ واریت کے بھوت،روحانی اقدار کی پائمالی، صوبائی عصبیت کے طوفانِ بدتمیزی،انسان دوستی کے نام پر خون کی ہولی،سورج کی شعاعوں کی گرفتاری کے نام پر زندگی کی شبِ تاریک کا عملی مظاہرہ،رنگ و نسل اور زبان کے نام پر جھگڑے، فرقہ بندی اور ذاتوں میں بٹوارہ:

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے
فلاکت سماں اپنا دِکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے
چپ و راست سے یہ صدا آ رہی ہے

کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

جنابِ صدر! آخری بات کہہ کر اجازت چاہوں گا۔ایک اُچٹتی ہوئی نظر ماحول پر ڈالیے، یہاں بے حیائی، عُریانی کی ڈائنیں اخلاق و ایمان کو کھا رہی ہیں۔فحاشی کی اشاعت میں ہمارا پریس، ہمارے اخبارات اور رسائل، ہمارے ذرائع ابلاغ، ہماری مخلوط مجلسیں اور ثقافتی اِدارے اِس ''کارِخیر'' میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔لوٹ مار اور اغوا کی وارداتیں اپنی جگہ، سیاسی زندگی ننگِ دین، ننگِ وطن کی تصویر ہے۔

تا حدِ نظر شعلے ہی شعلے ہیں چمن میں

معلوم ہوتا ہے کہ

چمن کے باغبان سے کچھ بھول ہوئی ہے

اِن حالات میں تعلیمی اِدارے ہیں جو آگے بڑھ کر اِس قوم کی نیّا کو پار لگا سکتے ہیں۔یہ اِس قوم کے اندازِ نظر کو بدل کر منظر تبدیل کر سکتے ہیں۔تعلیمی اِداروں میں بزرگوں کی زیرکی اور فراست بھی ہے اور نوجوانوں کا جوشِ عمل اور فکری پاکیزگی بھی۔اِس طرح تعلیمی اِدارے صلاحیت بھی رکھتے ہیں اور صالحیت (Piety) بھی۔جب وہ عمل سے آراستہ میدانِ عمل میں اُتریں گے تو یقیناً میدان اُن کا ہوگا۔کامیابی ان کے قدم چومے گی:۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

الوداعی تقریب سے خطاب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

اللہ کے بابرکت نام کے ساتھ جس کا ہر حکم حتمی اور حکمت خیز ہے۔ جو علم سے فیصلہ کرتا ہے اور حلم سے معاف کرتا ہے

جنابِ صدر! مہمانانِ گرامی قدر، معزز رُفقائے کار! حاضرین و ناظرین باتمکین!

السّلامُ علیکم! آج 31 جولائی 2010ء کی صبح طلوع ہونے والا سورج اُس ریٹائرمنٹ کی خبر لے کر آیا جو احباب کو ''پھر خزاں کی خبر ہے اور میں ہوں'' سنایا کرتا تھا۔ اکرم سعید پروفیسر شعبہ اُردو کے بعد مائیک اُسے ملا تھا۔ آج اِس خبر کا اعلان پروفیسر رانا محمد اکرم شعبہ انگریزی کے حصہ میں آیا ہے۔ جنابِ صدر! کائنات کی ہر شئے ''مسافر اور ہر چیز راہی ہے''۔ ''یہاں ٹھہرتا نہیں کوئی کاروانِ وجود''۔ یہاں دوام صرف ہمہ حال نئی شان والے پروردگارِ عالم کو ہے۔ تغیر فطرت ہے۔ تبدیلی حُسن ہے۔ انقلاب آرزو ہے۔

نکہت کی کوششیں کہ نکلنا نصیب ہو
موسم کو یہ لگن کہ بدلنا نصیب ہو

بقول کنفیوشش: "Only the change is permanent." بقول اقبال:

خدا سے حُسن نے اِک روز یہ سوال کیا — جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا — شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اِس کی — وہی حسیں ہے، حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا، یہ گفتگو قمر نے سُنی — فلک پہ عام ہوئی اخترِ سحر نے سُنی
سحر نے تارے سے سُن کر سُنائی شبنم کو — فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے — کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا شباب سیر کو آیا تھا، سوگوار گیا

جنابِ عالی! اِس کائنات میں کوئی وجود ہمیشہ کے لیے ایک جگہ پر موجود نہیں رہ سکتا۔ ہر لمحہ دوسرے لمحے کو رستہ دے کر رخصت ہو جاتا ہے۔ انسان کرسی پر بیٹھا بیٹھا بوڑھا ہو جاتا ہے۔ عمل نہ کرے تو بھی عمل جاری رہتا ہے۔ اِتنی بڑی حقیقت کو قبول کیے بغیر چارہ نہیں۔ آج کے اِس پُر وقار ایوان کے جذبات کی دھڑکنوں کے سائے میں ہم اِس امر کو سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ بندۂ حقیر پُر تقصیر نے آج سے اکیس (۲۱) سال پانچ دن قبل اِس مادرِ علمی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ شیخ جاوید صاحب پروفیسر شعبہ سیاسیات اُس وقت پرنسپل تھے۔ اُنھوں نے مجھے نیا ولولہ اور شوقِ عمل عطا کیا۔ اِس مادرِ علمی کے تمام پرنسپلز نے مجھے بے حد احترام دیا اور مجھ پر بھروسا کیا۔ یہ سب اُن کی عالی ظرفی اور کشادہ دِلی اور ذوقِ نظر کا نتیجہ تھا۔ خدا نے میرا بھرم رکھا۔ میری لاج رہ گئی۔ میرے رفقائے کار کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں۔ وقت کے قلیل اور نازک لمحات اس کی طوالت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ مجھے اُن کے احسانات کا احساس بھی ہے اور اعتراف بھی۔ الفاظ کا دامن تنگ اور جذبات کا آنگن وسیع ہے۔

جنابِ صدر! مَیں آپ کا ...... مہمانانِ گرامیِ قدر اور رفقائے کار کا تہہِ دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے اس تقریب کو چار چاند لگائے۔ جن دوستوں نے اِس تقریب کے انتظام و انصرام میں حصہ لیا، اُن کا ذکر نہ کرنا حق ناشناسی ہوگا۔ مضمون نگار اور خاکہ نویس تو اِس کالج کی دھڑکن ہیں۔ میں ان کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں جزائے خیر عطا کرے۔

خدا کرے قوّتِ بازو اور زیادہ

جنابِ صدر! اربابِ بست و کشاد، منتظمین تقریب، خاکہ نگاراں کے علاوہ کمرہ نمبر 23 اور 16 کے رفقائے کار نے شروع سے آخر تک جو مجھے شرفِ باریابی بخشا اور پنشن کے کاغذات کی ترتیب و تکمیل میں میری اعانت فرمائی میں اُن کا شکر گزار ہوں۔ میاں غلام رسول تو ہر درد کی دوا ہیں۔ اُن کا ثانی ابھی اِس کالج نے پیدا نہیں کیا۔ مابعد، میری دوسری نشست شعبہ فزکس میں تھی۔

بعض یارانِ ''باصفا'' کو یہ امر خوشگوار نہ لگتا تھا۔اُن کے طرزِ عمل کے نقوشِ محبت میرے دل پر ثبت ہیں۔

اِس فن کی لطافت کو لے جاؤں کہاں آخر
پتھر کا زمانہ ہے ، شیشے کی ''کہانی'' ہے

شعبہ بیالوجی کے صدر نشین پروفیسر محمد افضل مجھے راز دان سمجھتے ہیں۔باقی احباب تو مجھے اُستاد کا مقام دیتے رہے۔اُن کی قدر نہ کرنا حق ناشاسی ہے۔صدر شعبہ کیمیا اور دیگر احباب سے بھی میرے راہ ورسم گہرے اور اپنی اپنی نوعیت کے ہیں۔شعبہ ریاضی تو میرا پیر خانہ ہے۔جہاں پیر مراد جیسے زہد وورع کے اہلِ ظرف موجود ہیں۔نفیس احمد باجوہ سے میری تعلق داری کسی سے پوشیدہ نہیں۔بطور استاد پروفیسر امجد حسین اگر چہ اس مکتب میں نہیں ہیں لیکن میرے مکتب میں ہمیشہ رہے ہیں۔مجھے اُن کا اعتماد حاصل ہے۔وہ مجھ پر اعتبار کرتے ہیں۔پیرِ مغاں نذیر حسین چودھری صدر شعبہ فلسفہ کی دستگیری مجھے حاصل رہی ہے۔ان کی رہنمائی میرے لیے چراغِ راہ تھی۔اللہ پاک اجر دے۔شعبہ انگریزی، فارسی، عربی سے میرا حسبی اور نسبی تعلق ہے۔زبانیں جداجد امگر افکار کی یک رنگی ادبی وفکری وحدت کا ذریعہ ہے۔بزرگوں کی خدمات اور خوردوں کی اطاعت کا ذکر کہیں ریا کا باعث نہ بن جائے۔یوں بھی ''حسابِ دوستاں در دل است'' والا معاملہ ہے۔ غرضیکہ شعبہ جغرافیہ، سیاسیات، تاریخ، معاشیات، تعلیمات، عمرانیات، اسلامیات، نفسیات اور تعلیمِ جسمانی و کمپیوٹر سائنس سب کو میں نے اپنا خیر خواہ پایا۔میں سب کا زیر بارِ منت ہوں۔ویسے توفیضِ نظر کے لیے ضبطِ سخن ضروری تھا مگر مجھ سے ممکن نہ ہوا۔گویا اِس کالج کے برگ و بار، شجر و حجر، اِس کے کشادہ رستے، اِس کے سبزہ زار، مرغزار، اس کے مسکراتے چہرے، لہلہاتی روشیں، اِس کے جعفر و صادق، اِس کے رفیق، شفیق اور صدیق سب مجھ پر مہربان رہے۔مادرِ علمی کے گل اور بوٹے، اِس کے انور، اِس کے سرور، اِس کے لیاقت اور سلامت مجھے سب کی قدر دانی کا احساس ہے۔میں بھی دل سے اُن کی قدر کرتا ہوں۔

آخری بات یہ کہ اُستاد ہمیشہ میرا آئیڈیل رہا ہے۔ یہ محکمہ اور تدریسی عمل میرا نصب العین ٹھہرا۔ احباب اور قدر دانوں کی پیش کش اور تجاویز کے باوجود بہت پُر کشش محکموں پر کبھی میری نظر نہیں گئی۔ اِس شعبہ کا انتخاب میرا پہلا اور آخری انتخاب رہا۔ پھر اِس مادرِ علمی (گورنمنٹ کالج شیخوپورہ) کی تعظیم شروع سے میرے دل میں نقش گر تھی۔ بعض اوقات صبح کے وقت ڈیوٹی کے لیے جب میں اِس مادرِ علمی کے قریب سے گزرتا تو قومی ترانے کے پُرسرور الفاظ اور دھنیں اور قومی ترانے کا احترام مجھے روک لیتا۔ میں سواری سے اُتر کر ایستادہ ہو کر قومی ترانہ سُنتا، مادرِ علمی کو سیلوٹ کر کے اپنی راہ لیتا تھا۔ اب تو 21 سال سے زائد عرصہ سے یہاں ہوں۔

میں بارِ دیگر جناب پرنسپل اور احباب کا شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے اپنا گراں مایہ وقت مجھ پر قربان کیا اور میرا مان بڑھایا۔

یہی تو ہے ہمارے ہاتھ کی آخری کوشش
تمھارے واسطے کچھ ہو نہ ہو، دستِ دعا ہوتا

☆☆☆☆☆☆

خواب سرا

از پروفیسر صدیق شاہد

جنابِ صدر! معزز سامعین کرام محمد صدیق علی مرزا جو ایک جیّد پروفیسر، بلند پایہ شاعر، شاہد تخلّص کرتے ہیں۔ اعلیٰ پایہ نثر نگار اور پرنسپل کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔ اُن کی کتاب ''خواب سرا'' کے بارے میں میرے خیالات کیا معنیٰ رکھتے ہیں؟ پھر بھی احباب کا حکم سر آنکھوں پر۔ غزل کے ایک مقطع سے گفتگو کا آغاز کرتا ہوں:

محو ہوتا نہیں میں لوحِ جہاں سے شاہد
زندہ رکھنے کو مجھے میرا چمن کافی ہے

میں نہ تو غالب کا طرف دار ہوں اور نہ کوئی بڑا سخن فہم۔ پھر ایسا شاعر جو احمد ندیم قاسمی، حفیظ تائب، مشکور حسین یاد، پروفیسر خواجہ زکریا، ڈاکٹر سلیم اختر، قتیل شفائی اور شہزاد احمد جیسے اہلِ نقد ونظر سے داد پا چکا ہے تو مجھے حجاب سا ہوا۔ مرزا صاحب کا ایک شعر آگے بڑھا اور مجھے حوصلہ ہوا کہ شاید میرا کوئی لفظ اُن کی شان کے قابل ہو۔ شعر تھا:

ایک بھی شعر نکل آئے بہت ہے شاہد
ورنہ بے کار غزل گوئی ہماری ہے میاں

جنابِ صدر! خاموش چہرہ، خاموش لفظ کی طرح صاحبِ نظر کے سامنے بولتا ہے۔ صاحبِ نظر سکوتِ لالہ وگل سے ہم کلام ہوتا ہے۔ فطرت کے نظارے اُس کے صوم وصلوٰۃ ہوتے ہیں۔ اُس کے احساسات اُس وقت تک صورت پذیر نہیں ہوتے جب تک اُن میں تاثیر پیدا نہ ہو جائے۔ اِس سلسلہ میں صدیق شاہد کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

کسی بھی خام جذبے کا اثر اچھا نہیں ہوتا
جو ٹوٹے وقت سے پہلے ثمر اچھا نہیں ہوتا

***

مرزا صاحب کا اندازِ فکر نہایت مثبت ہے۔ وہ زندگی میں چیزوں کے روشن پہلو کو دیکھتے ہیں۔ یہ دنیا اُنھیں رنگ و نور میں ڈوبی لگتی ہے۔ وہ گلاس کو آدھا بھرا دیکھتے ہیں اور آدھے خالی سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ یہی اندازِ فکر اُن کی شاعری میں جاری و ساری ہے۔

بشر عیب و صواب اکثر بہم آمیز رکھتا ہے
جو صرف عیبوں کو ہی دیکھے بشر اچھا نہیں ہوتا

قدم قدم پہ مناظر ہیں حُسن کاری کے
سرُور و کیف سے سینے کو بھر لیا جائے

پروفیسر صدیق شاہد کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ''جنوں میں کیا کیا کچھ بکنے کے قائل نہیں۔'' اُن کے ہاں دردمندی بھی ہے اور سوزِ آرزومندی بھی۔

شریکِ جشن غریبوں کو کر لیا جائے
یہ جرم ہے تو اِسے اپنے سر لیا جائے

ہر بات تول کر، ہر قول سوچ کر، توازن سے، تناسب سے، اعتدال اور ہنرمندی سے بیان کرتے ہیں

حدودِ ہوش سے آگے نہ ہم بڑھے شاہد
ورائے ہوش، سُنا ہے، عجب تماشا تھا

بلکہ روشنی اُن کے ہاں استعارہ ہے۔ روشنی ہر صورت روشنی ہے۔ میں ذاتی طور پر نئی اور پرانی روشنی کا قائل نہیں ہوں۔ میرے نزدیک روشنی کا متضاد تاریکی، اُجالے کا متضاد اندھیرا ہے۔ نئی اور پرانی کی تراکیب اضافی ہیں۔

بات کرنے کا بھی ڈھب ہوتا ہے
ڈھب یہ کم فہموں میں کب ہوتا ہے

فصیلِ شعر پہ روشن اگر ہوں حُسن کی شمعیں
تو اِک اِک لفظ شاہد روشنی کا استعارہ ہو

***

قدر کا شعورِ زندگی کا بڑا انقلاب تھا اور انسان کا شرف۔ اُن کے ہاں اقدار کی خوب پاسداری ملتی ہے۔ وہ باکمالوں سے محبت کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باکمال ایک طرف، صاحبِ جمال بھی اُن کی دل سے قدر کرتے ہیں۔

جو باکمالوں کی توقیر کم کرے شاہد
ہمارے ہاتھ کوئی ایسا بھی ہُنر نہ لگے
رسیدگانِ کمالات کے قدم تو لو
یہ عاجزی تمھیں عالی جناب کر دے گی

اور ساتھ اعلیٰ اقدار کے مٹنے کا قلق، ہر صاحبِ نظر کی طرح اُن کے ہاں بھی موجود ہے۔ اُن کا ایک مصرعہ دیکھیے:

نئی ہوا مرا جینا عذاب کر دے گی
بھلی قدروں کی شاہد کچھ نہ پوچھو
بڑا مہنگا سماں اب آ گیا ہے
چمن بندوں کی آرائش کے باعث
چمن تو اور بھی کمھلا گیا ہے
جس بلندی پہ ناز تھا، اُس سے
زینہ زینہ اُترتے جاتے ہیں

جنابِ صدر! ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔ دونوں کو سمت و رفتار، رنگ و آہنگ، وزن و وقار ایک دوسرے سے ملا ہے۔ غزل کے صحیفے میں دوغزلہ ، سہ غزلہ، قافیہ پیمائی، شعبدے، اوباشی، نعرہ زنی، توبہ استغفار ممنوع ہے۔ ”ستارہ می شکنند و آفتاب می سازند“ کا عمل غزل کے ہر شعر پر کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا غزل صنفِ سخن ہی نہیں معیارِ سخن بھی ہے۔ ردیف و قافیے کی ظاہری و معنوی دروبست کا لحاظ کرنا، زبان و لہجہ کا خیال رکھنا، بات کتنی ظاہر

کی جائے، کتنی چھپائی جائے گی، کہاں پردے سے بے پردگی اور کہاں بے پردگی سے پردہ متصوّر ہوگا۔ ان تمام پابندیوں سے صرف وہی شاعر عہدہ برآ ہوسکتا ہے جو شاعری اور شرافت کے تقاضوں کا احترام کرنا جانتا ہو۔ گویا غزل ''ریزہ کاری'' میں ''مینا کاری'' ہے۔

پروفیسر صدیق شاہد چونکہ اس ''قتالۂ سخن'' کے اسیر ہیں لہٰذا اُن کا مقام خود بخود سر اُٹھا کر چلنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور اِس میدان میں چشمِ نم، بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ سر اُٹھا کر چل رہے ہیں۔ میں بلاخوفِ تردید اقرار کرتا ہوں کہ ''خواب سرا'' لاجواب مجموعۂ سخن ہے۔

بعض ناقدین کا خیال ہے کہ غزل دربار کے آس پاس رہتی تھی۔ اس کا شجرہ نسب بادشاہت سے ملتا ہے۔ اِس کا وجود بے ضرورت ہے۔ اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب تک حُسن و محبت کی باتوں اور گھاتوں سے آشنا لوگ موجود ہیں، خواتین اور خدا جہاں ہوں گے (اور کہاں نہیں ہیں)، وہاں غزل خواں بھی موجود ہوگا۔ پھر ندرت ہی جذبوں کے جمال کا معیار نہیں ہوا کرتی۔ جذبے کا حُسن تو اُس کی سچائی ہے۔ اور اظہار کی دل کشی اُس کا اعتماد ہے۔ جب تک جذبوں کی سچائی، اظہار کی دلکشی اور شہرِ ذات کے دروازے اندر کی طرف کھلتے رہیں گے تب تک غزل کی اہمیت، ضرورت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں۔

پروفیسر صدیق شاہد کی مایہ ناز تصنیف ''خواب سرا'' کی تعبیر تو تقریبِ رونمائی کے بعد تقریبِ پذیرائی میں عیاں ہوگی۔ بعض لوگ خواب کو محض خیال کا ہالہ سمجھتے ہیں لیکن ''برادرانِ یوسف'' نے اُن کے خواب کو حقیقت ہی سمجھا تھا اور اپنی منصوبہ بندی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔ وہ تو نصرتِ خداوندی ہے کہ تارِ عنکبوت سے ''غارِ ثور'' کے کھوج رسانوں کو واپس کر دیتی ہے۔ وہ فقیرِ کنعاں کو مصر کی بادشاہت عطا کر دیتی ہے۔

''تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ''

جنابِ صدر! آخری بات کہہ کر اجازت چاہوں گا۔ صدیق شاہد صاحب رجعتِ قہقری کا شکار بھی نہیں ہوئے کیونکہ اُنھوں نے بقول اُن کے ''بہت سا مجموعہ کلام'' دریچہ کے حوالہ سے لکھا

ہے۔مختار مسعود نے اپنی کتاب ''لوحِ ایام'' کا انتساب بھی ''چراغ اور دریچہ کے نام'' کیا ہے۔وہ دریچہ جو ایک روشن مستقبل کی طرف کھلتا ہے۔جس سے تازہ ہوا آئے گی اور جہانِ تازہ کی خبر دے گی۔

غزالی کا کہنا ہے کہ دل کے پانچ دروازے ہیں جنھیں حواسِ خمسہ کہتے ہیں۔وہ عالم محسوسات کی طرف کھلتے ہیں۔ایک دروازہ اور ہے جو عالم روحانی کی طرف کھلتا ہے۔غزالی نے دروازوں کی بات کی ہے،کھڑکی کا ذکر نہیں کیا۔تجربہ شاہد ہے کہ زندگی میں اگر کوئی انقلابی لمحہ آجائے تو دل میں خودبخود ایک کھڑکی کھل جاتی ہے۔

دریچہ میں بیٹھ کر صدیق شاہد صاحب نے ماضی بھی دیکھا اور مستقبل بھی! اُن پر عرفان وآگہی کے دروازے کے دونوں پٹ کھلے ہیں۔یہی اُن کی فکرِ رسا کی علامت ہے۔لہٰذا یہی وجہ ہے کہ وہ ہر جدت کو بدعت نہیں جانتے۔دریچہ کی نوجوان نسل اور جواں سالہ لوگوں کی محفل میں براجماں ہیں۔اہلِ دریچہ نے بھی صدیق شاہد کو سینے سے لگا کر اپنے سینے کو کینے سے پاک ہونے کا ثبوت دیا ہے۔مجھے ان کا عشق حقیقی لگتا ہے۔

داناؤں کا کہنا ہے کہ عشقِ مجازی میں رقیب ناگوار ہوتا ہے۔جب رقیب قریب اور ہم سفر ہو جائے تو یہی عشق،عشقِ حقیقی بن جاتا ہے۔اہلِ دریچہ اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جن کے نزدیک ہر پرانی چیز بے معنی ہوتی ہے،خواہ وہ سایہ دار درخت ہی کیوں نہ ہو۔ایک نئی بستی میں شجر کاری دیکھ کر ایرانی دانش ور جلال آلِ احمد نے کہا تھا:''یہاں سارے درخت نوجوان ہیں،اِس لیے بے سایہ ہیں۔اہلِ دریچہ کی خوش بختی کہ پروفیسر صدیق شاہد جیسا بڑا سایہ دار درخت بھی اُن کے آنگن میں موجود ہے جس سے ہم سب بہرہ مند ہو رہے ہیں۔

نئی ترنگ ، نیا رنگ اور نئی خُو بُو
جدا ہی لذتیں اُس کا وصال رکھتا ہے

☆☆☆☆☆☆

مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی علیٰ رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

سامعین کرام! ''خاکہ نگاری'' کے اور بھی نام ہیں، ''سیرت نگاری''، ''شخصیت نگاری'' یا ''مرقع نگاری''، جو بہت مشکل کام ہے۔ ہر ایک کے بس کا نہیں۔ پروفیسر سید وقار عظیم کے بقول: ''آدمی کے لیے آدمی کی پرکھ سے زیادہ دشوار کام شاید کوئی نہیں کہ وہ جتنا باہر سے نظر آتا ہے اُس سے زیادہ اندر چھپا ہوا ہے۔'' یا خود بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے بقول: ''ہم عصر مشاہیر کے حالات لکھنا (قدما) کے مقابلے میں بہت کٹھن ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنے بہت سے ہم عصروں کی سیرتیں لکھی ہیں۔ کتاب میں کل 24 خاکے ہیں۔ کتاب کا نام ''چند ہم عصر'' ہے۔ ایک خاکہ ''پروفیسر مرزا حیرت'' اُن کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ باقی 23 سیرتیں اُن کے قلم سے ہیں۔ کچھ مختصر ہیں اور کچھ طویل۔ مولوی صاحب کے بقول خاکہ نگار کا کام ایک سنگلاخ راہ اور پُرخار وادی میں قدم رکھنا ہے۔ اِس راہ کی دِقتوں اور وادی کی دُشواریوں کا ذکر اُنھوں نے ''سرسیّد احمد خان کی سیرت میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''تصویر جس قدر بڑی، شان دار اور نفیس ہوتی ہے اُسی قدر اُسے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے تاکہ اُس کے خد و خال نمایاں طور پر واضح ہو سکیں اور صناع کے کمال اور تصویر کے حُسن و قبح کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ یہی حال بڑے لوگوں کا ہے۔''

پروفیسر وقار عظیم کے بقول: ''مولوی صاحب نے اشخاص اور افراد کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ بے لاگ انداز میں کہا ہے۔ اپنی ذاتی پسند اور ناپسندیدگی کو حق اور سچ کا پردہ نہیں بننے دیا۔ جس کے متعلق کہا پوری واقفیت سے کہا۔ مشاہدہ نے جو کچھ دِکھایا، اُسے مطالعہ سے تقویت پہنچائی۔ عہد کی تاریخ اور ماحول کو شخصیت اور سیرت کا آئینہ دار بنایا۔ مواد کی فراہمی میں محنت اور کاوش سے

کام لیا اور اِس مشاہدے، مطالعہ اور تجزیے کے بعد اشخاص اور افراد کی زندگی اور کاموں کی صحیح تصویر کھینچ کر دِکھائی۔‘‘

اگر چہ اُن کی سیرتوں میں خوبیوں کا رنگ غالب ہے اور یہ خوبیاں ممدوح کو ہماری نظر میں محبوب بھی بناتی ہیں، لیکن ہم یہ کہیں محسوس نہیں کرتے کہ مولوی صاحب کی مدح وثنا قصیدہ بن گئی ہو۔ ہر آدمی بہر حال آدمی ہی ہوتا ہے۔ چاہے کتنا بڑا ہو۔ خطا اور قصور کے بغیر شخصیت ادھوری رہتی ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اُنھیں خطاؤں اور خامیوں سے محبوبی کی شان اُبھرتی اور اُجاگر ہوتی ہے۔ ویسے بھی کہتے ہیں کہ محبوب کا نا خوب بھی خوب لگتا ہے۔ اِس سے یہ مراد نہیں کہ محبوب بے خطا ہوتا ہے۔ حیدر آباد کے جلسۂ تعزیت میں سید محمود مرحوم پر جو تقریر کی تھی اُس میں یہ الفاظ بھی تھے:

’’اس عزیز کی زندگی ہمارے لیے ایک بیش بہا سبق اور حیرت ناک عبرت ہے۔‘‘

دوستو! دنیا میں نہ کہیں خالص نیکی پائی جاتی ہے اور نہ خالص بدی۔ اِسی طرح انسان بے عیب ہوا ہے نہ ہوگا۔ عزیز مرزا مرحوم کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ جملہ لکھا:

’’لیکن آخر میں حیدر آباد کی زندگی نے ایک خفیف سا نقص خوشامد پسندی کا پیدا کر دیا تھا مگر بے عیب ذات خدا کی ہے۔‘‘

’’غرض مولوی صاحب مرحوم ایک کم سخن، خاموش طبع، فلاسفر مزاج، کوہِ وقار، عالی خیال شخص تھے۔‘‘ (مولوی چراغ علی)

’’ایک صائب رائے، معتدل مزاج، بے لاگ اور باخلوص کام کرنے والے کا اُٹھ جانا غضب ہے۔‘‘ (خواجہ غلام ثقلین)

مولوی صاحب اپنے موصوف اور ممدوح بلکہ موضوع کی صفات کو کبھی کبھی یکجا کر دیتے ہیں اور کبھی ایک صفت کا ذکر کر کے اور اُس کی تائید میں واقعات بیان کرتے ہیں جو ایک قسم کی دلیل کا کام دیتے ہیں اور رائے کو مؤثر اور باوقار بنا دیتے ہیں۔ اُن کے خیال میں شخصیت

کی تعمیر و تشکیل میں کئی چیزیں مل کر حصہ لیتی ہیں۔ بڑی مُدّت، بڑی ریاضت، بھرپور استقامت کے بعد شخصیت کا پھول کھلتا ہے جس سے کسی شخص کی زندگی کے رخ کا تعین ممکن ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق کہتے ہیں:

''آدمی کو کچھ تو ورثے میں باپ دادا سے ملتا ہے، کچھ تعلیم و تربیت اور ماحول سے اور کچھ اپنی سعی اور اِرادے سے۔''

یہی بات ایک اور انداز میں دوسری جگہ کہی ہے:

''اخلاق کچھ تو انسان کو فطری طور پر ارثاً ملتے ہیں اور کچھ تعلیم اور صالح ماحول اور صحبت سے میسر آتے ہیں۔''

آپ لوگ تو بی۔ایڈ کے طالبِ علم خوب جانتے ہیں کہ ماحول اور وراثت انسانی شخصیت پر کیا کیا اثرات مرتّب کرتے ہیں۔ خاکہ نگار کا نکتہ نظر ہمدردانہ ہونا ضروری ہے۔ ہر اِنسان اہم اور ہر جگہ ضروری ہے۔ ہر معمولی انسان میں بھی اس کا غیر معمولی پن دیکھا جا سکتا ہے۔ جبھی تو کہتے ہیں حُسن دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ شخصیت جس قدر توانا اور جاذبِ نظر ہوگی اُس کا اسلوب اور اندازِ بیاں اُتنا ہی دل کش اور دل آویز ہوگا۔ انسان ہر لحاظ سے قابل احترام ہے۔ اِس میں ادنیٰ اور اعلیٰ کا فرق اضافی اور بعض اوقات ہمارا اپنا پیدا کردہ ہوتا ہے۔

شاعری روزِ ازل سے ہوئی تخلیق ندیم
شعر سے کم نہیں، انسان کا پیدا ہونا

مولوی عبدالحق کے خاکوں کی لفظی تصویریں قابل لحاظ، سبق آموز، زندگی کے تجربات کا نچوڑ، اخلاقی و جمالی اقدار کے نقوش پیش کرتی ہیں:

''بیرونی امداد بڑی کارآمد اور مفید چیز ہے۔ بشرطیکہ دِلوں میں شوق اور جوش اور ہمت ہو، لیکن اگر کوئی چاہے کہ ہم کچھ نہ کریں اور ہمارے لیے سب کچھ ہوتا جائے تو محض خیالِ خام ہے۔'' (مولوی چراغ علی)

''اشراف کا سنبھالنا بہت مشکل کام ہے۔ اِس میں ایک آن بان اور خود داری ہوتی ہے جو بہادری اور انسانیت کا اصل جوہر ہے۔ ہر کوئی اس کی قدر نہیں کرسکتا اِس لیے شریف روتا اور ذلیل ہنستا ہے۔ یہ جتنا پھیلتا ہے وہ اُتنا ہی سُکڑتا ہے۔'' (گُدڑی کالال)

''انسان جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو مذہب کی پناہ ڈھونڈتا ہے۔'' (محسن الملک)

''بے تعصبی کا وصف اُن ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔'' (حالی) ''شہرت وہ بلا ہے کہ جہاں آتی ہے کچھ نہ کچھ شیخی آ ہی جاتی ہے۔'' (حالی)

''سچائی، نیکی، حُسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اُونچی ذات والوں میں۔'' (نام دیو مالی) ''کام اُس وقت ہوتا ہے جب اُس میں لذّت آنے لگے۔ بے مزہ کام، کام نہیں بیگار ہے۔'' (نام دیو مالی)

صدائے تیشۂ مزدور ہے ترا نغمہ
تُو سنگ و خشت سے چنگ و رباب پیدا کر

''غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر اور غریب کا کوئی فرق نہیں۔'' (نور خاں سپاہی)

احباب! خاکہ نگاری، آپ بیتی یا سوانح نگاری ایک ہی تصویر کے مختلف رخ ہیں۔ جب اپنے واقعات خود لکھے تو ناقابل فراموش اور ''جہانِ دانش'' جیسی خود نوشت سوانح عمری (Autobiography) کوئی دوسرا لکھے تو ''آبِ حیات''، ''حیاتِ سعدی'' اور ''یادگارِ غالب'' جیسی شہرہ آفاق سوانح عمریاں۔ مختصر لکھے تو ''مردم دیدہ'' از چراغ حسن حسرت، ''ہم نفسانِ رفتہ'' اور ''گنج ہائے گراں مایہ'' از قلم رشید احمد صدیقی، ''شیش محل'' از شوکت تھانوی اور سب کے پیش رو اور اُن پر بالا ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی کچھ اپنی زبانی'' اور وحید الدین سلیم کے وہ دو لافانی مرقعے جو مرزا فرحت اللہ بیگ کی خطابت اور قوتِ ایجاد کا بہترین مظہر ہیں۔ لیکن مولوی عبدالحق کی

کتاب ''چند ہم عصر'' ''چیزے دیگر است'' کے مصداق اپنا الگ امتیاز رکھتی ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔

پورے سائز کی سوانح عمری اور ایک خاکے میں وہی فرق اور نسبت ہے جو ایک مربوط اور مکمل ناول اور ایک مختصر کہانی یا افسانے میں ہوتا ہے۔سوانح عمری اگر سمندر ہے تو خاکہ ایک چھوٹی سی آب جُو۔سوانح عمری میں تصویر کو پوری تفصیل کے ساتھ سامنے لانا ضروری ہوتا ہے جسے نبھانے کے لیے بھرپور تاریخی شعور کی ضرورت پیش آتی ہے۔مرقع نگاری میں تاریخی شعور سے زیادہ انفرادی ہاَ ثر اور ردِّ عمل مشعل راہ بنتا ہے۔مختصر رقبہ اور پیمانہ پر کام کرنے کے لیے واقعات کی کھتونی کی بجائے صرف اہم اور معنی خیز اِشاروں، وقت کے چند اہم نقطوں اور شخصیت کی بوقلمونی میں سے چند نقوش کو اسیر کر لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔اِس طرح مرقع نگار ہمیں ایک عالم اصغر سے دو چار کر دیتا ہے۔جس کی بنیاد پر ہم عالم اکبر کا قیاس کر سکتے ہیں۔پرانے تذکروں میں مرقع نگاری کا کوئی اِس قسم کا تصوّر نہیں ملتا۔مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب ''آبِ حیات'' میں جو کردار نگاری کی گئی ہے چند اُچٹتے ہوئے اِشاروں کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔پہلے خاکے وہی ہیں جن کا اُوپر ذکر گزر چکا ہے۔

اسلوب احمد انصاری کے بقول:

''مولوی صاحب نے اِس نگار خانے میں جن بظاہر متخالف شخصیتوں کو جمع کر دیا ہے اور اُن کی جن اخلاقی اور انسانی خوبیوں کو سراہا ہے، اس سے اُن کے مرکزی اقدارِ حیات کے تعین کا مسئلہ آسان ہو جاتا ہے۔مولوی عبدالحق صاحب ہمارے ادب میں جو مرتبہ رکھتے ہیں اُس کی بنیاد تین چیزوں پر ہے۔اوّل اُن کی گہری تحقیقی نظر، دوسرا اُن کا اسلوبِ بیاں اور اُن سب پر مستزاد وہ پہیم لگن اور عالمانہ شیفتگی جو اُنھیں اُردو زبان کی ترویج و اشاعت اور اس کی بقا و استقلال سے ہے۔طرزِ شیفتگی کے بارے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی صدر شعبہ اُردو علی گڑھ یونیورسٹی کے جملے کا حوالہ نہ دینا حق ناشناسی ہوگا۔جملہ یہ کہ:

''بابائے اُردو اِس متاعِ کنعاں (اُردو) کے یعقوب بھی رہے اور زلیخا بھی۔''

اِن مرقعوں میں کہیں کہیں طنز و مزاح کے ہلکے ہلکے چھینٹے بھی نظر آتے ہیں لیکن ان پر عقل کا زبردست پہرہ ہر جگہ بیٹھا ہوا ہے۔

عزیزانِ گرامی! مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کے متعلق ڈاکٹر محمود اِلٰہی کا حوالہ دل چسپی اور معلومات افزائی کا باعث بنے گا۔ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر عبدالحق نے جہاں ایک زندہ و توانا ادب کی تمام اصناف پر توجہ دی وہاں سیرت و شخصیت نگاری کے فن کی طرف بھی مائل ہوئے۔ ''چند ہم عصر'' اُن کے اسی میلانِ طبع کا نتیجہ ہے۔ اُردو ادب کی تاریخ میں اُن کے اِن سوانحی خاکوں کی اہمیت کبھی کم نہ ہوگی۔''

ڈاکٹر سیّد عابد حسین لکھتے ہیں:

''مصنّف یوں تو اپنی تحریر کے اُسلوب اور مضمون میں اپنی شخصیت کی ایک جھلک دکھانے پر مجبور ہے۔ لیکن خاص کر اُس وقت جب وہ دوسروں کی سیرت پر قلم اُٹھاتا ہے۔ اُس کے ''خلوت کدۂ ذات'' کا حجاب اُٹھ جاتا ہے۔ اوروں کے جوہر پرکھنے میں خود اُس کے جوہر کھل جاتے ہیں۔ اِس نکتے کو مدِّ نظر رکھ کر ''چند ہم عصر'' کا مطالعہ کریں، ان رنگا رنگ صورتوں میں خود اُن کی صورت اور سیرت کی جھلک دیکھیے اور لطف اُٹھائیے۔''

ڈاکٹر سیّد معین الرّحمن ''چند ہم عصر'' کا تنقیدی جائزہ میں لکھتے ہیں:

ایک ایسے منظر کی تصویر کھینچنا جس میں پہاڑ بھی ہوں اور صحرا بھی ہو، دریا بھی ہو، آسان ہے۔ لیکن انسانی خصائل یا کسی ادائے خاص کی تصویر کشی بہت مشکل ہے۔ خاکہ نگاری میں عکس ریز (ایکس ریز) کی طرح ظاہر کی بجائے باطن کو بھی ٹٹولنا پڑتا ہے۔ ''چند ہم عصر'' اِس ذیل کا یادگار مجموعہ ہے۔ اس سے اُردو میں مرقع نگاری کا مان دان سلامت ہے۔ مختلف اوقات میں لکھی گئی یہ تحریریں سب سے پہلے اُن کے عزیز شاگرد شیخ چاند نے جمع کی تھیں۔ وہ طبع نہ کروا سکے۔ اُن کے انتقال کے بعد انجمن ترقیِ اُردو (ہند) نے اسے شائع کیا۔ اس سے پہلے ایڈیشن میں چودہ خاکے

تھے۔ 1942ء میں ''چند ہم عصر کا دوسرا ایڈیشن جمال پریس دہلی سے طبع ہوا۔ اِس ایڈیشن میں راس مسعود، میرن صاحب اور نام دیو مالی کے خاکوں کا اضافہ ملتا ہے۔ یہ مجموعہ بہت مقبول ہوا۔ تقسیمِ ہند کے بعد نظر ثانی اور اضافے کے بعد 1950ء میں تیسرا ایڈیشن قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کے دیباچے کے ساتھ چھپا۔ سر سیّد احمد خان پر مولوی صاحب کا سیر حاصل خاکہ اِس ایڈیشن میں شامل ہے۔ جس کی ضخامت 125 صفحات پر مشتمل ہے بذاتِ خود ایک کتابچہ کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ 1953ء میں انجمن کی طرف سے چوتھا ایڈیشن طبع ہوا۔ اِس پر تحسین سروری کا مختصر سا دیباچہ ہے۔ اس میں عبدالرّحمن صدیقی، حسرت موہانی، پروفیسر محمد اقبال، پروفیسر ری ہٹ سک اور عبدالرّحمن بجنوری پر مضامین کا اضافہ ہے۔ پانچویں ایڈیشن پر سن اشاعت درج نہیں۔ نواب عماد الملک کا مضمون اس ایڈیشن میں پہلی بار شامل ہوا۔ قرائن بتاتے ہیں کہ یہ 1956ء کا سال ہوگا۔ ''چند ہم عصر'' کا چھٹا ترمیم اور اضافہ شدہ ایڈیشن مولوی صاحب کے اپنے مختصر دیباچے کے ساتھ اُردو اکیڈمی سندھ کراچی کی طرف سے 1959ء میں شائع ہوا۔ اب بھی مولوی صاحب پر بہت سا کام ہو رہا ہے۔ تفصیلات کا موقع نہیں۔ وہ گاندھی پر بھی لکھنا چاہتے تھے مگر زندگی نے وفا نہ کی۔

عزیز طلبہ! آپ تھک تو نہیں گئے۔ سیّد معین الرّحمن اور ڈاکٹر خلیق انجم کے تبصرے کے ساتھ بات ختم کرتا ہوں۔ ''مولوی صاحب کے خاکے ہیئت اور مواد کے اعتبار سے قابل قدر ربطِ خاطر نے انھیں لکھوایا ہے۔ کاوش، توجہ اور سلیقے نے اُنھیں وقیع بنایا ہے۔ سارے خاکے عبدالحق کے شاہکار اور اُردو اَدب کے جواہرِ آب دار ہیں۔ ان کی چمک دمک کبھی ماند نہیں پڑ سکتی۔ جوں جوں انسانی خصائل سے پردے اُٹھتے جائیں گے ان شخصیات کے نقوش کی آب و تاب بڑھتی جائے گی۔''، خلیق انجم کے بقول: ''خاکوں میں جو بیان کی شگفتگی اور شیرینی ہے، کہیں کہیں بذلہ سنجی اور شوخیِ گفتار، تشبیہات اور استعارات کا برجستہ استعمال لب و لہجہ کی بے ساختگی اور محاوروں کی چاشنی ہے، اس نے ان خاکوں کو اُردو اِنشا پردازی کی بہترین مثال بنا دیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

احمد ندیم قاسمی اور افسانہ نگاری

سامعین کرام و ناظرین باتمکین! ہمارا آج کا موضوعِ سخن ہے:

''احمد ندیم قاسمی اور افسانہ نگاری''

احمد ندیم قاسمی ایک عظیم شاعر اور کالم نویس بھی ہیں اور اعلیٰ افسانہ نگار بھی۔ وہ جدید تحریکات سے متأثر ہوئے اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ اِسی لیے تو کہتے ہیں:۔ ''زندگی بغیر رومان کے پھیکی اور بے کیف رہتی ہے اور رومان بغیر شاعری کے رومان نہیں بنتے۔ لٰہذا احمد ندیم قاسمی کے افسانے زندگی، رومان اور شاعری سے مل کر بنتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی 1923ء میں یتیم ہو گئے۔ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ سات سالہ بچے کی بساط ہی کیا۔ لیکن فطرت کا انداز ملاحظہ ہو کہ کس طرح فطرت کس طرح لالہ کی حنا بندی کرتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی اُردو کے نامور شاعرِ رومان اختر شیرانی کے ہاں قیام پذیر بھی رہے۔ اُن کا یہ قیام عرب ہوٹل میں تھا۔ یہ کوئی 1942ء کے بعد کا واقعہ ہے۔ اُن دِنوں اختر شیرانی کی شاعری کے چرچے تھے۔ اُن کی مہمان نوازی اور دوست داری بھی اپنی مثال آپ تھی۔ اختر اخلاص ومحبت کا پیکر، ہمدردی کی مجسم تصویر:

محبت کے لیے آیا ہوں میں دنیا کی محفل میں
محبت خون بن کے لہلہاتی ہے مرے دل میں

احمد ندیم قاسمی نے شاعری اور رومان کا درس اُن سے لیا اور بڑے کامیاب رہے۔ احمد ندیم قاسمی ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ آرٹ فرد کی شخصیت کا اظہار ہے۔ انفرادی احساسات و جذبات کا ترجمہ آرٹسٹ کا کام تخلیق اور تلاشِ حُسن ہے۔ اور مقصود سرُور یا مسرت

آفرینی۔

واغودن خویش را بر دیگرے

اظہارِ ذات ، اِنکشافِ ذات

غمِ ذات سے غمِ کائنات کا سفر ادب کہلاتا ہے۔ یہ کوئی آسان مرحلہ نہیں ہے۔

بقول مرزا اسداللہ خاں غالب:

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسد

پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

یا اقبال کے بقول:

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

قاسمی صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کا شاعرانہ انداز ہے۔ وہ خواہ کسی چیز کا ذکر کر رہے ہوں غیر شاعر بننا اُن کے لیے ممکن نہیں ہے۔ وہ اپنے افسانوں اور شاعری میں ہمیشہ توجہ اور کاوش سے کام لیتے ہیں۔ شاعری کی زبان میں اِسے ہی ''خونِ جگر'' کہا جاتا ہے۔ خونِ جگر کی یہ سرخی ہمارے موجودہ دَور کے افسانہ نگاروں میں کسی نے اِتنے خلوص اور تواتر کے ساتھ صرف نہیں کی جتنی ندیم نے اور اِسی لیے اُن کا ہر افسانہ فن کا بڑا حسین مرقع ہے۔

(پروفیسر حیات سیال)

احتشام حسین لکھتے ہیں: ''احمد ندیم قاسمی افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں ایک بڑی جگہ اور منفرد جگہ رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے مسلسل اچھے افسانے لکھے۔ اور اِس وقت تو مشکل ہی سے کوئی ایسا افسانہ ہوگا جو آبشاروں کی صدا کی طرح دامنِ دل کو نہ کھینچتا ہو۔ فن کے شعور، موضوع کی بصیرت اور مواد پر قدرت تنوع (Variety) فن کار کے گداز دل، کسی حیثیت سے بھی دیکھا

جائے وہ ایک مکمل افسانہ نگار ثابت ہوتے ہیں۔"

احبابِ گرامی! اِس زندگی کا چلن اور حُسن تین طبقوں کا مرہونِ منّت ہے۔ پہلا طبقہ شہداء کا ہے، جس کی موت قوم کی حیات قرار پاتی ہے۔ شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے۔"اور جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں اُنھیں مُردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں مگر تمھیں شعور نہیں۔"(القرآن)

دوسرا طبقہ محسن انسانیتؐ سے لے کر دیگر محسنین کا ہے۔ جس میں آپ بھی شامل ہیں۔ شہید قوم کے لیے جان دیتا ہے جبکہ محسن قوم کے لیے زندہ رہتا ہے۔"بے شک اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں کے قریب ہوتی ہے۔"(القرآن) ایک کا صدقہ جان ہے اور دوسرے کا تحفہ زندگی۔

ایک تیسرا طبقہ بھی ہے،"اہلِ جمال" کا طبقہ۔ اللّٰہ جَمِیلٌ وَّ یُحِبّ الْجَمَالُ۔ اللہ خوب صورت ہے اور خوب صورتی کو پسند کرتا ہے۔ اِنھی اہلِ جمال کا کمال ہے کہ وہ اپنے فن کے ذریعہ دنیا کو حسین تر بناتے رہتے ہیں۔ یہ اُموی بادشاہ کی طرح مسجدِ قرطبہ بھی تعمیر کرتے ہیں اور لاہوری درویش اقبالؒ کی طرح "مسجدِ قرطبہ" تحریر بھی۔ یہ فنِ تعمیر کے شائقین بادشاہ بھی ہو سکتے ہیں اور حُسنِ تخلیق کے شاہکار شاعر اقبال بھی۔ احمد ندیم قاسمی کا تعلق، واسطہ اور سلسلہ اِسی طبقے سے بنتا ہے۔

انسان اپنی تخلیقات سے کائنات کے حسن میں مینا کاری کرتا ہے۔ فطرت کی راتوں کو چراغاں کرتا ہے، صحراؤں کو گلشن بناتا ہے، دریاؤں کے رخ پھیر کر تاریخ کے دھارے تبدیل کر دیتا ہے۔ صفحۂ قدرت پر خوب صورت حاشیے چڑھاتا رہتا ہے۔ یوں تو کائنات میں قدرت نے حسن کے لنگر بکھیر رکھے ہیں۔ فن کار جہاں کمی دیکھتا ہے اُسے پوری کر دیتا ہے۔ دنیا ایسے لوگوں کے فیض سے آباد ہے۔ چراغِ آرزو ان کے وجود سے روشن

ہیں۔اگر چہ تعداد میں تھوڑے ہوتے ہیں مگر عمل میں سبقت لے جاتے ہیں۔

گلشن دہر میں اگر جُوئے مئے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

شاعر کو اعترافِ حقیقت ہے۔بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے:

مِرے نغموں نے اے دنیائے غم چمکا دیا تجھ کو
تِرے ظلمت کدے میں زندگی کی روشنی کب تھی

اقبال کے بقول:

شاعرِ دل نواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اُس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری

عزیزانِ گرامی قدر! آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ احمد ندیم قاسمی کے ہاں طبقاتی ناہمواریوں، دولت کی غیر مساوی تقسیم، "Have and have not" کی وسیع خلیج اور استحصال کے خلاف شدید ردِّ عمل ملتا ہے۔وہ دیکھتے ہیں کہ اُن کی باندیاں بھی ریشم کے تھانوں میں تُلتی ہیں اور ہماری بیٹیوں کے تن کی عُریانی نہیں جاتی۔وہ دیکھتے ہیں کہ چڑیوں کے تمام گھونسلے تو ایک ہی وضع، ایک ہی سطح کے اور ایک جیسے ہوتے ہیں مگر انسانوں کے مکانات میں اِتنا فرق کیا معنی رکھتا ہے۔اِس فرق کی وجہ سے انسانوں میں کئی طرح کے لوگ پیدا ہو گئے ہیں۔صرف ملک میں نہیں بلکہ بیرونِ ملک مہنگی جگہ پر۔جہاں اشتہا کہیں ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔وہ حیرت زدہ ہیں کہ: ''کیا سے کیا کیا ہو گیا ہے۔''

وہ جنتا سے ہیں اور جنتا کے ہیں۔جنتا کے لیے لکھتے ہیں۔حساس دنیا کا ادیب کبھی شاعری میں اور کبھی افسانوں میں مسلسل یہ اِظہار کرتا نظر آتا ہے۔اُن کی شاعری اور دیگر تخلیقات میں ترقی پذیر سوسائٹی کا ذہن کارفرما نظر آتا ہے۔وہ دَورِ حاضر کے رجحانات کے علم

بردار ہیں۔وہ ہمہ وقت انسانیت کو بلندیوں پر فائز دیکھنا چاہتے ہیں۔وہ فیض احمد فیض کی طرح پوری انسانیت کے دُکھ درد کو سینے میں چھپائے پھرتے ہیں۔

اُنھوں نے پریم چند کی طرح دیہات کے افسانے لکھ کر قومی خدمت کا فرض دل سے ادا کیا ہے۔کہتے ہیں جہاں فرضِ منصبی اور خواہش قلبی کی سرحدیں مل جائیں اُسے خوش بختی کی علامت سمجھنا چاہیے۔ندیم کے ہاں یہ علامت بدرجہ غایت موجود ہے۔

آلِ احمد سرور کے بقول:"احمد ندیم قاسمی اچھے افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ قاسمی نے پنجاب کے دیہات کی روح کو مقیدّ کرلیا ہے۔اُن کے افسانے حقیقت کی تصویریں ہیں۔فطرتِ انسانی کا گہرا مطالعہ اور زندگی کی تبدیلیوں کا گہرا احساس اور اِدراک اُن کے ہاں پایا جاتا ہے۔" معاشرہ اُن کے مزاج اور طبع کے برعکس ہے۔

کچھ غلط بھی تو نہیں تھا مِرا انتہا ہونا
آتش و آب کا ممکن نہیں یک جا ہونا

ایک نعمت بھی یہی ، ایک قیامت بھی یہی
روح کا جاگنا اور آنکھ کا بینا ہونا

جو برائی تھی مِرے نام سے منسوب ہوئی
دوستو! کتنا بُرا تھا مِرا اچھا ہونا

اِس کے باوجود وہ نا امید نہیں۔چونکہ ناامیدی کفر ہے۔فرمانِ اِلٰہی ہے۔لَاَ تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہ۔اُنھیں یقین ہے کہ ادبار کے بادل چھٹیں گے۔شبِ غم سحر آشنا ہوگی۔ وہ چراغِ آرزو روشن رکھے ہوئے ہیں۔اُس کے آنگن میں بہار کے امیدوار۔

قعرِ دریا میں بھی آنکلے گی ، سورج کی کرن
مجھ کو آتا نہیں محرومِ تمنّا ہونا

منشی پریم چند کی طرح وہ زندگی کے زیرک ناظر ہیں۔ وہ دیہاتوں کے سب سے بڑے نقاش ہیں۔ اُن کے افسانوں میں دیہاتوں کی عمدہ تصاویر نظر آتی ہیں۔ دیہاتی زندگی کے مختلف مسائل اور وہاں کا ماحول دیہاتیوں کی صاف، پُرخلوص زندگی، محبت، پیار اور قربانی و ایثار کے جذبے، اُن کے افسانوں میں پنجاب میں پلنے بڑھنے، کام کرنے والے دیہاتی اپنی بے تکلفی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ مناظر کی عکاسی پُرکشش، دل کش اور جاذبِ نظر ہے۔ ان مناظر میں یکسانی نہیں تنوع ہے۔ پنجاب کی سماجی زندگی اور ماحول تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ وہ خود دیہاتی پس منظر رکھتے تھے۔ 1916ء میں ضلع سرگودھا کی تحصیل خوشاب کے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ یہ رغبت اور رجحان فطری بھی ہے اور خوش گوار بھی۔ ویسے بھی جب تک انسان فطرت کے قریب رہتا ہے۔ سچائی کی رغبت رہتی ہے۔ اس کے باوجود وہ تقاضے بھی اُن کی نظروں سے اوجھل نہیں جو وقت بدلنے کے ساتھ نئے زمانے کے نئے صبح و شام لاتے ہیں۔

دوستو! ہم نام تو بھول ہی گئے۔ احمد شاہ نام اور احمد ندیم قاسمی ادبی نام ہے۔ آپ کے والد پیرِ غلام نبی مرحوم اپنی عبادت، زہد و تقویٰ کی وجہ سے اہل اللہ میں شمار ہوتے تھے۔ اعلیٰ اقدار کی پاسداری، علم دوستی کے ساتھ اِنسان دوستی تو اُن کی میراث ٹھہری۔ پسر میراثِ پدر ہے۔ والد کے انتقالِ پُرملال کے بعد اپنے چچا حیدر شاہ کے پاس کیمبلپور چلے گئے۔ وہاں مذہبی، علمی اور شاعرانہ ماحول میسر آیا۔ 1931ء میں میٹرک اور 1935ء میں بی اے کیا۔ 1939ء میں محکمہ آب کاری میں ملازم ہو گئے۔ ایسے آزاد منش لوگوں کو ملازمت کب راس آتی ہے۔ 1942ء میں ملازمت چھوڑ کر لاہور چلے آئے۔ پھر یہیں کے ہو گئے۔ ''تہذیبِ نسواں'' اور ''پھول'' کی ادارت سنبھالی۔ 1943ء میں ''ادبِ لطیف'' کے ایڈیٹر ہوئے۔ تقسیمِ ہندو پاک کے بعد ڈیڑھ سال ریڈیو پاکستان پشاور میں ملازم

رہے۔ پھر ہاجرہ مسرور (''سب افسانے میرے'' کی مصنفہ) کے ساتھ مل کر ''نقوش'' کی ادارت سنبھالی۔''امروز'' سے بھی وابستہ رہے۔''فنون'' کا ادبی پرچہ بھی ان کی زیرِادارت نکلتا رہا۔ ہاجرہ مسرور اور اُن میں گہری فکری مشابہت ہے۔ جبھی تو کسی نے لکھا تھا کہ فرشتہ دو روحیں ایک ہی گھر کے لیے لے کر آیا تھا۔ ایک روح جلدی میں کہیں گم ہوگئی۔ جب ملی تو جلدی سے ہاجرہ مسرور کے گھر کی بجائے انگہ کے دیہات میں پیر غلام نبی کے گھر رکھ دی۔ یہ روح احمد ندیم قاسمی کے قالب میں قیام پذیر ہوئی۔

عزیزانِ من، خواہران و برادران! آپ اُکتا تو نہیں گئے؟ آخری بات کہہ کر اجازت چاہوں گا۔ ناول اور افسانے کا فرق پورے سائز کی سوانح عمری اور ایک قلمی مرقع سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ ناول میں واقعات کا پھیلاؤ اور اس کے امکانات کو سمندر سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ جبکہ افسانہ ایک آب جو کی حیثیت رکھتا ہے۔ نثر میں افسانہ اور نظم میں غزل اختصار یا تلخیص کی نادر مثالیں ہیں۔ ناول پوری زندگی کو محیط ہوتا ہے جبکہ افسانہ زندگی کے ایک پہلو یا رخ پر مشتمل ہے۔ ہمیلٹن کے بقول: ''افسانے کا مقصد کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ اور مؤثر انداز میں پڑھنے والے کے ذہن میں ایک واحد اثر پیدا کرنا ہوتا ہے۔'' سمرسٹ مام نے افسانے کے وقت کو کم کر کے دس منٹ سے ایک گھنٹہ تک کی قید لگائی ہے۔ آج کل یہ سب سے مقبول صنفِ سخن کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوی مجموعے ''رِم جھم''، ''شعلۂ گل''، ''دشتِ وفا'' (ادبی انعام یافتہ)، ''سنّاٹا''، ''آس پاس''، ''در و دیوار''، ''چوپال''، ''کپاس کا پھول'' اور ''گھر سے گھر تک'' ہیں۔ مؤخر الذکر شہری تکلفات، نمود و نمائش کا مظہر، سفارش، بابو کی مادیت گزیدہ حقیقت اور روحانیت گریز رویہ کا مظہر ہے۔

ادب کا یہ پجاری موسمِ گرما 2006ء میں ایک فضائی حادثے میں راہیِ ملکِ

عدم ہوا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اُس دن کسی ایک اور اہم شخص جو حادثہ میں داعیِ اجل کو لبیک کہہ گیا تھا اس کی موت کی خبر اور تجہیز و تکفین کے مراحل میں باقی لوگوں، مسافروں یا عدم کے مسافروں کو وہ شہرت نصیب ہوئی ہو جس کے وہ حق دار تھے۔ دنیا کے معاملات بھی عجب ہیں۔ جس طبقاتی نظام کو توڑنا چاہتے تھے اُسی کے اسیر ہوئے۔ مجھے یاد آیا کہ اُن کے مونس و غم خوار اختر شیرانی کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا تھا۔ جبکہ 12 ستمبر 1948ء کو قائدِ اعظم کی نعش کو کندھا دینے اور تدفین کے لیے سب لوگ کراچی جا چکے تھے اور اختر شیرانی شاعرِ رومان کو چند لوگوں کی معیت میں میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ اِسی لیے تو آسکر وائلڈ نے کہا تھا کہ: ''بڑے درخت کے نیچے چھوٹے درختوں کی نمو رک جاتی ہے مگر یہ لوگ مر کر بھی زندہ ہیں۔'' ان کا ذکر چلتا ہی رہتا ہے۔

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے، اِدھر نکلے

21 اپریل 1938ء کو جب علامہ اقبال کو بادشاہی مسجد کے میناروں کے سایہ میں دفن کیا گیا تھا تو ایک مقتدر انگریز (شاید کمشنر لاہور) نے کہا تھا: ''آج آپ نے ہندوستان کے آخری مسلمان کو دفن کر دیا ہے'' تو اہلِ دل نے کہا مسلمان مرتا نہیں بلکہ زندہ رہتا ہے۔

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یا

آخر کو لالہ ہو کے اُگا نو بہار میں
خونِ شہیدِ عشق نہ زیرِ زمیں رہا

☆☆☆☆☆☆

آج کا انسان مقصدِ تخلیق پورا کرنے سے قاصر ہے

صدرِ ذی وقار و سامعین ذی محتشم! آج کے زیرِ بحث موضوع ''آج کا انسان مقصدِ تخلیق پورا کرنے سے قاصر ہے'' سے کون انکار کرسکتا ہے؟ شعر واَدب اور تاریخ و واقعات کی دنیا اِس اعترافِ حقیقت سے بھری پڑی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا کہنا بجا:

موت سے کس کو مفر ہے مگر انسانوں کو
پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے

ستاروں پر کمندیں ڈالنے اور سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرنے والا انسان زندگی کی شبِ تاریک سحر نہ کرسکا۔ بے شک انسان نے پرندوں کی طرح ہواؤں میں اُڑنا سیکھ لیا ہے۔ دریاؤں میں مچھلیوں کی طرح تیرنا بھی سیکھ لیا ہے مگر زمین پر انسانوں کی طرح رہنا نہیں سیکھا۔ اہلِ نظر کہتے ہیں کہ طاقت میں رحم خدائی صفت ہے جبکہ رحم کے بغیر قوت بہیمت کہلاتی ہے جو وحشت، ہولناکی، خوف وخطر اور تباہی و بربادی کی فضا پیدا کرتی ہے۔ یہی حالت آج کے انسانوں کی نظر آتی ہے۔

دانش و حکمت کی ساری روشنی کے باوجود
کم ہی ملتا ہے زمانے میں کم آزار آدمی
کُلبلاتی بستیاں، مشکل سے دوچار آدمی
کتنا کم یاب آدمی ہے کتنا بسیار آدمی

جنابِ صدر دیکھنا یہ ہے کہ مقصدِ تخلیق کیا ہے؟ زمین پر انسانوں کی طرح رہنا، دوسروں کے حقوق کی حفاظت اور دنیا کو امن وآشتی کا گہوارہ بنانا۔ تمام مذاہب کی تعلیمات کا بنیادی نکتہ یہی ہے کہ توحیدِ خداوندی کے ساتھ خدمتِ خلق کا فریضہ ادا کیا جائے۔ حدیثِ نبویؐ کے مطابق

مسلمان کی تعریف:

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ

یعنی مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔ انسانوں میں بہتر کون ہے؟ خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاسِ ، لوگوں میں بہتر وہ ہے جو دوسروں کے لیے نفع رساں ہو۔ اُن میں سہولیات تقسیم کرے، اُنھیں آسانیاں فراہم کرے تاکہ اُس کا خدا اُسے زمین پر سہولتیں اور آسمان پر مغفرتیں عطا کرے۔ حالیؔ بے ساختہ پکار اُٹھا:

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

حالی ہی نہیں بلکہ ہر اہلِ نظر جانتا ہے کہ:

ساری دنیا اپنا گھر ہے مل کر اِسے سجاؤ
آپا دھاپی چھوڑ کے بچو! پیار کے دیپ جلاؤ

چونکہ خدمت مقبول عبادت ہے، اہلِ دل کہتے ہیں عبادت کی قضا ہے مگر خدمت کی قضا نہیں۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے آتے ہیں جو کام دوسروں کے

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو، خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

گویا تخلیق کا مقصد تھا: آسودگی، فلاحِ انسانیت، دکھوں کا مداوا، چمنستانِ دہر کو امن کے پھولوں سے مہکتا دیکھنا، آشتی کی کلیوں کو مسکراتا دیکھنا ہے۔ تخلیق کا مقصد محبت، پیار، اُمید، صداقت، عدالت کے چراغ روشن کرنا ہے۔ ظلمت کدہ کو کور ذوقی، کم نگاہی، تعصب، نفرتوں سے نکال کر خود آگہی، شعورِ ذات سے شعورِ حق تک پہنچانا تھا:

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہُدیٰ کا کہ ہے ساری مخلوق کُنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا خلائق سے ہے جس کو رشتہ وِلا کا
یہی ہے عبادت، یہی دین و ایماں کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

مگر افسوس، صد افسوس! ''لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ'' کے مصداق:

تا حدِّ نظر شعلے ہی شعلے ہیں چمن میں
پھولوں کے نگہبان سے کچھ بھول ہوئی ہے

جنابِ صدر! اِس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ انسان نے مادی طور پر بہت ترقی کرلی ہے۔ اس کی فتوحات کے آگے عناصر کا قلب و جگر کانپ رہا ہے۔ اِس کی ایجادات نے زندگی کو آسان کر دیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ زمانہ اس کی آنکھوں کے اشاروں پر رقص کر رہا ہے۔ گردوں کے ستارے اسے حیرت سے دیکھ رہیں۔ خورشیدِ جہاں تاب کی ضَو اِس نے گرفتار کرلی ہے، ستاروں پہ کمندیں ڈال لی ہیں، مریخ کا سفر شروع کر رکھا ہے۔ ایجادات نے برسوں کے فاصلے سمیٹ دیے ہیں:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

لیکن افسوس! مشینوں کی جھنکار نے چہرے کی مسکراہٹیں چھین لی ہیں۔

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

اس کے ائیر کنڈیشنر کی خنک لہریں اندر کی فضا کو خوش گوار کر دیتی ہیں مگر راہ رووَں کے قافلوں پر آگ برسا رہی ہوتی ہیں۔ مادی ترقی کے باوجود انسانی تباہی کے دِل دوز مناظر مقامِ عبرت ہیں۔ ہیروشیما کی تباہی، ناگاساکی کی رِستی لاشیں، ویت نام میں برستی آگ کے شعلے، افغانستان میں کارپٹ بمبنگ (Carpet Bombing)، عراق میں کیمیائی ہتھیاروں کی تلاش کے بہانے اسلحہ و بارود کی طاقت کا اِظہار، کربلائے معلّیٰ سے اُٹھتے شعلے یزیدِ ثانی کے ظلم کی داستاں بیان کر رہے ہیں اور پھر انسانیت کے منہ پر طمانچہ ہیں۔ امن عالم کے اِدارے یہ خونیں کھیل دیکھ کر خاموش ہیں! کیونکہ ''تمھارے ووٹ کیا ہوتے ہیں جب کہ ویٹو ہمارا ہے۔

اِنسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

جنابِ صدر! آخری بات یہ کہ:

''آج کی ترقی، ترقی پذیری اور ترقی یافتگی نے انسان کو کثیر المقاصد بنا دیا ہے۔ وہ خواہشات کے انبار تلے دب گیا ہے۔ آج کا انسان سسک رہا ہے، کراہ رہا ہے۔ آج کی خوشی صرف ضبطِ غم کا شعور ہے۔ آج کا معاشرہ اجتماعی مسرّتوں کا قائل ہے اور نتیجہ کہ انسان مسرّت کدوں میں خوش نظر آتا ہے اور غم کدوں میں تنہا ہے۔ اس کا اپنا گھر دعوتوں میں جگمگاتا ہے اور تنہائیوں میں ٹمٹماتا ہے۔ آرزو کے بے ہنگم پھیلاؤ میں

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

گنگنا رہا ہے۔ پھر تو یہی کہنا ہوگا: ''آج کا انسان مقصدِ تخلیق پورا کرنے سے قاصر ہے۔

☆☆☆☆☆☆

والدین میری محبت

جنابِ صدر! معزز سامعین کرام! آج جس موضوع پر ہمیں لب کشائی کا موقع ملا ہے اُس سے کون انکار کرسکتا ہے؟ زیرِ بحث موضوع ''والدین میری محبت'' کا سلسلہ اِتنا وسیع، جامع اور آفاقی ہے کہ ذُرّیتِ آدم کا کوئی فرد اِس سے انکار کی جسارت نہیں کرسکتا۔

جنابِ صدر! محبت کیا ہے؟ ''زمین کے سفر میں اگر کوئی چیز آسمانی ہے تو وہ محبت ہی ہے۔'' شعراء نے محبت کے قصیدے لکھے۔ غزلیں تحریر ہوئیں، محبت کی یاد میں مرثیے پڑھے گئے لیکن محبت کی جامع تعریف نہ ہوسکی! آئیے دیکھیں اقبال کیا کہتے ہیں؟

چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغِ جگر مانگا
اُڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زُلفِ برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفس ہائے مسیحِ اِبن مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی
ملک سے عاجزی، اُفتادگی تقدیرِ شبنم سے
پھر اِن اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی سے
مرکب نے ''محبت'' نام پایا عرشِ اعظم سے
خرامِ ناز پایا آفتابوں نے، ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے

ایسی پاکیزہ، مطاہر، انمول چیز آخر کس کے لیے مخصوص کرنا مناسب رہے گا تو بلا خوفِ تردید کہوں گا کہ ''والدین میری محبت ہیں۔''

جنابِ صدر! یوں تو دنیائے ادب میں والدہ کی محبت کے بہت چرچے ہیں۔قدرت اللہ شہاب کی "ماں جی"، میکسم گورکی کی "ماں"، علامہ اقبال کی "والدہ مرحومہ کی یاد میں"، نظم سے کون واقف نہیں۔لکھتے ہیں:

جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جانِ ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں
اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیِ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشمِ گوہر بار کے
خاکِ مرقد پر تری ،فریاد لے کر آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو یاد آؤں گا؟

جنابِ صدر! کسی بڑے پادری نے چھوٹے طالب علم پادری سے وائیوا(Viva) کے دوران میں پوچھا: "حضرت مریم کا تعارف بیان کریں۔" چھوٹے طالب علم پادری نے پیٹی کو کھولا۔نئے سرے سے کس کر پیٹی کمر سے باندھی، ہاتھوں کو سینے پر رکھا اور نہایت احترام سے گویا ہوا: "فادر! حضرت مریمؑ کا اِس سے بڑھ کر کیا تعارف ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ ہیں۔" مقام اور عظمت کی اِس سے بڑھ کر کیا دلیل ہو سکتی ہے؟ اقبال "اسرارِ خودی" میں حضرت مریمؑ سے حضرت فاطمہؑ کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "حضرت مریمؑ کی ایک نسبت اُنھیں رفعت سے ہم کنار کرتی ہے جب کہ حضرت فاطمہؑ کی تین نسبتیں رفعت کے کس مقام پر فائز ہوں گی؟ وہ دانائے سُبُل، ختم الرُّسل، مولائے کل کی بیٹی، سیّد الشہداء حضرت امام حسینؑ کی ماں اور حیدرِ کرّارؓ کی رفیقۂ حیات ہیں۔

جنابِ صدر! والدین اور اولاد کی محبت کا رشتہ لازوال، بےلوث، بےغرض، بے بدل، ازلی و ابدی اور عالم گیر صداقتوں کا حامل ہے۔بنی نوعِ انسان کی ساری تاریخ اس سے وابستہ، فکری اِرتقا کی تمام تر کہانی ان کے دم قدم سے ترقی کے مینا خانۂ حیرت کی داستان ان کی بدولت،

روحانیت کے سفر کا سکوت و تحیر ان کا اعجاز، ایوانِ سیاسیات سے دیوانِ معیشت کی تمام تر چکا چوند اِن کی مرہونِ منت ہے۔ غرض یہ کہ اِن کی شبوں کا گداز، ان کے دِنوں کے اُجالوں میں جان کاہی کا عمل، ان کا سراپا ایثار، ان کا خونِ جگر دے کر اولاد کی پرورش کے سارے مراحل بے مثل اور بے بدل ہیں۔

روایت کرتے ہیں کہ کوئی صحابی اپنی ضعیف، ناتواں اور عمر رسیدہ والدہ کو حج کے مناسک کی ادائیگی کے لیے کندھوں پر اُٹھائے جگہ جگہ پہنچا۔ کبھی بیت اللہ کا طواف، کبھی صفا و مروہ کی سعی، کبھی قیامِ منیٰ، کبھی عرفات کی حشر سامانی میں حاضری کا شرف، کبھی مزدلفہ کی شب بسری، کبھی جمرات پر سنگ زنی، طوافِ زیارت سے طوافِ وداع کے روح پرور مناظر تک سارے معاملات وجد و شوق کے عالم میں ادا کرتا رہا۔ بعد از اں بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوا۔ صحابیؓ نے ختمی مرتبت پیغمبرِ آخرالزّماں سے دریافت کیا کہ کیا اُس نے والدہ کا حق خدمت ادا کر دیا ہے؟ آقائےؐ دو جہاں کی طرف سے اِرشاد ہوا ”نہیں“ ابھی ایک رات کا بھی حق خدمت ادا نہیں ہوا۔

جنابِ صدر! والد کی محبت کا اظہار ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں باپ راضی تو رب راضی۔ آؤ کنعان کے در و بام اور کوچہ و بازار سے پوچھیں! جدائی کے گداز کی داستان دربارِ مصر سے دریافت کریں جہاں محبوب کا فراق بینائی چھین لیتا ہے اور محبوب کی قمیص کی خوشبو سے بینائی لوٹ آتی ہے۔

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کُن   کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زُلیخا را

جنابِ صدر! محبت سے آشنا ہونے والا انسان ہر طرف حُسن ہی حُسن دیکھتا ہے۔ اُس کی زندگی نثر سے نکل کر شعر میں داخل ہو جاتی ہے۔ وہ نیوٹن نہیں رہتا بلکہ مِلٹن ہو جاتا ہے۔ والدین کو اولاد کا ہر نا خوب بھی خوب لگتا ہے۔ محبوب کی اِس تعریف پر والدین کے لیے اولاد سے بڑھ کر کوئی اور پورا نہیں اُترتا۔ جبھی تو میں کہتا ہوں:

”والدین میری محبت“ نہیں بلکہ والدین ہی میری محبت ہیں۔

جنابِ صدر! آخری بات یہ کہ قرآنِ مجید فرقانِ حمید نے والدین سے حُسنِ سلوک کے لیے جگہ جگہ ارشاد فرمایا۔ ترجمہ: ''اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی سے رہنے کی تاکید کی ہے۔'' (سورۃ عنکبوت، آیت نمبر ۸۔

اِرشاد ہوا: ''والدین سے نیکی کرو۔''

سورۃ لُقمان میں اِرشاد ہوتا ہے: ''یہ کہ تو میرا شکر گزار بن اور اپنے والدین کا بھی۔''

سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوتا ہے: ''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کہ تم جو مال خرچ کرو تو والدین کے لیے کرو۔'' بلکہ ایک مقام پر تو یہ حکم بھی ہوا: ''پس اُن کو اُف بھی نہ کہو۔''

اِس تاکید کے بعد وہ کون بدنصیب ہوگا جو والدین کی محبت کا دم نہ بھرے گا۔

مندرجہ بالا دلائل و براہین، کوائف وحقائق اِس صداقت کے مظہر ہیں کہ ''والدین میری محبت'' ہیں۔

لیکن یہ سب اللہ کی توفیق رفیق ہونے سے ممکن ہے۔

یا رب ! یہ التجا ہے ، کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ جو دل پر اثر کرے

☆☆☆☆☆☆

اے وطن تو نے پکارا تو لہو کھول اُٹھا

جنابِ صدر اور معزز سامعین کرام!

آج کی بزم میں جس عنوان پر لب کشائی کے لیے ہم حاضر ہوئے ہیں اسے اگر الفاظ کی سلک میں پرو یا جائے تو ترکیب کچھ یوں ترتیب پاتی ہے:

"اے وطن تُو نے پکارا تو لہو کھول اُٹھا"

جنابِ صدر! ایک شک رفع کرنا ضروری ہے۔ حُبِّ وطن ایک فطری جذبہ ہے۔ شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ وطن سے تو محبت رکھتے ہیں مگر مغربی نظریہ وطنیت کی مخالفت کرتے ہیں۔ آج کا موضوعِ سُخن "اے وطن تو نے پکارا تو لہو کھول اُٹھا۔" یہ نعرۂ مستانہ صرف اظہارِ خیال ہی نہیں بلکہ مسلّمہ اعترافِ حقیت بھی ہے۔ یہ محض جذبہ ہی نہیں عزم بھی ہے۔ اِس امرِ واقعہ سے کیسے اختلاف ہوسکتا ہے کہ ہم خاکی ہیں اور خاک سے وابستگی ہماری سرشت میں داخل ہے۔ ارضِ وطن سے ہمارا تعلق محض "وجودی" نہیں بلکہ قلبی ہے۔ وطن عزیز کی مٹی ہمیں جان سے پیاری ہے۔ یہاں کے ذرے ذرے ہمارے لیے دیوتا ہیں۔ کہکشاں کے ستاروں سے کہیں روشن، ماہتاب کی کرنوں سے خوش گوار اور خوش نما۔ یہاں کی فضائیں نکہت فزا اور یہاں کی ہوائیں مشکبار ہیں۔ صرف اِس لیے کہ اِس کی بنیاد لاالٰہ اِلاّ اللہ کے اُس نظریے پر ہے جو سراپا بہار ہے۔ جسے اِس نظریے سے محبت نہیں وہ محمدؐ عربی سے تعلق اور وفاداری کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتا۔ پھر کیوں نہ کہوں؟

"اے وطن تُو نے پکارا تو لہو کھول اُٹھا"

جنابِ صدر! وطن عزیز کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کی اساس جس نظریہ پر ہے

اُس کا اعلان فاران کی چوٹیوں سے ہوا۔ یہ گھٹا بطحا کے پہاڑوں سے اُٹھی۔ یہ پکار اُحد کی گھاٹیوں سے ہوتی ہوئی شرق و غرب میں پھیل گئی۔ اس سے قیصر و کسریٰ کے ایوان لرز اُٹھے۔ بادشاہت کی جگہ خلافت اور استبداد کی جگہ انصاف اور رواداری نے لے لی۔ بندۂ مومن امین اور حق مالک ٹھہرا۔ 712ء میں برِصغیر میں اِس صدا نے محمد بن قاسم کے سحاب وجود کی صورت اختیار کی۔ جہانگیر اور عہدِ اکبری میں یہ پکار حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی صورت پیغامِ حق بن کر اُبھری۔ اِس کی بنیاد میں لاکھوں شہیدوں کا لہو ...... ہزاروں اور لاکھوں عابدوں اور زاہدوں کے سجدے شامل ہیں۔ سیّد احمد بریلوی شہید کی ولولہ انگیزی، گمنام مجاہدوں کے دارورسن کی داستانیں، 1857ء کے شہیدوں کی تاب و تب اِسی نورِ سحر کے لیے تھی۔ مولانا عبید اللہ سندھی، شاہ ولی اللہ، سر سیّد احمد خان اور مولانا محمد علی جوہر سے لے کر علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان تک کتنی ہی عظمتیں ہیں جن کی نگاہوں کی تمنّا اِسی صدائے لا اِلٰہ کی رفعت کے لیے وقف تھی۔ پھر تاریخ کی آنکھ نے یہ دیکھا کہ قائدِ اعظم کی مثالی قیادت نے اِن خوابوں کو تعبیر عطا کی۔ اِسی تعبیر میں رنگ بھرنے کے لیے لاکھوں ماؤں کی جھولیاں خالی ہوگئیں۔ بہنوں کے ''بیرن'' بچھڑ گئے۔ بیویوں کے سہاگ لُٹ گئے۔ وہ گھر سے بے گھر ہو گئے۔

یہ ساری کاوشیں تھیں دین کی، ایمان کی خاطر
ہزاروں کلفتیں تھیں ایک پاکستان کی خاطر

پھر سب نے وہ روح پرور اور فرحت افروز منظر دیکھا۔ 13 اگست 1947ء کے روز پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا جس میں ملکہ برطانیہ کے نمائندہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اعلان کیا کہ کل سے وطن عزیز کی باگ ڈور تمھارے ہاتھ میں ہوگی۔ سامنے جلی حروف میں لکھا تھا! ''تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ یعنی تُو جس کو چاہے ملک عطا کر دے۔''

14 اگست 1947ء کی صبح جاں فزا تھی۔ بندرگاہ پر فوجی بینڈ بج رہا تھا۔ دھن خاموش تھی اور سُر مدھم۔ فوجی سپاہی آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے جہاز میں سوار ہو رہے تھے۔ جہاز نے لنگر اُٹھایا، تاریخ نے ورق پلٹا اور ہاتفِ غیبی سے آواز آئی: ''وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ اور تُو جس سے چاہے ملک چھین لے۔''

جنابِ صدر! ممکن ہے بعض لوگ خیال کر رہے ہوں کہ اِس مادیت گزیدہ ماحول میں محبت اور ارضِ پاک سے عقیدت کے کیا معنی؟ آج سائنس کی دنیا، سائنسی ایجادات کا زمانہ، مریخ کے سفر کی کہانیاں .... نفسی نفسی کے عالم میں محبت کے راگ کیسے؟ لیکن شاید وہ اِس راز سے واقف نہیں ہیں۔ بقول واصف علی واصف: ''زندگی صرف نیوٹن ہی نہیں، زندگی مِلٹن بھی ہے۔ زندگی صرف حاصل نہیں، ایثار بھی ہے۔ زندگی کارخانوں کی آواز ہی نہیں، احساسِ پرواز بھی ہے۔ زندگی صرف ''میں'' ہی نہیں، زندگی ''وہ'' بھی ہے، ''تُو'' بھی ہے اور سب سے بڑی بات زندگی خود ہی معراجِ محبت بھی ہے۔ اور ارضِ پاک کی محبت میں جب سب یکساں شامل ہو جائیں تو محبت مجاز سے نکل کر حقیقت کا روپ اِختیار کر لیتی ہے۔

جنابِ صدر! یہ سونا اُگلتے کھیت، بہترین نہری نظام، برف پوش چوٹیاں، معدنیات کے بیش بہا ذخیرے، نمک سے لے کر ایٹمی دھات یعنی یورینیم کی کانیں، شمالی علاقہ جات کا قدرتی حُسن، رنگ رنگ کے چار موسم، بل کھاتے پہاڑی سلسلے، میلوں تک پھیلے صحرائی اور ریگستانی علاقے۔ گویا:

چاند میری زمیں، پھول میرا وطن میرے کھیتوں کی مٹی میں لعلِ یمن

کے علاوہ صلاحیتوں سے بھرپور نوجوان نسل لیکن ہماری بے تدبیری کہیے یا حرماں نصیبی: یہ ڈرے ڈرے، سہمے سہمے ان جانے خوف، چلتے بم، گرتی لاشیں، کٹتے سر، پرخچے اُڑتے جسم،

چکنا چور شیشے، یہ داغ داغ اُجالا ، یہ شب گزیدہ سحر .... ارضِ وطن سے محبت کی ضرورت ایسے حالات اور ماحول میں دو چند ہو جاتی ہے۔ آؤ عہد کریں:

خونِ دل دے کے نکھاریں گے رخِ برگِ گلاب
ہم نے گلشن کے تحفّظ کی قسم کھائی ہے
اے ارضِ پاک تجھ کو درخشاں کریں گے ہم
اب تجھ کو رشکِ لعل بدخشاں کریں گے ہم
ہوں گے نہ دہر میں کبھی منت پذیرِ غیر
اب آپ اپنے درد کا درماں کریں گے ہم

ارضِ پاک ہماری آرزوؤں کا محور، ہماری آزادی کا نشیمن، ہماری راحتوں کا مسکن اور ہمارے انجام کا مدفن بھی ہے۔ ارضِ پاک کی مٹی میں چھپی ہمارے اسلاف کی قبریں، اُن کے مقابر ہماری روایت کے امین اور جہدِ مسلسل کے روشن مینار ہیں۔ اِس ارضِ پاک کی بقا کے لیے ہم اپنی ذات کی فنا تک بھی گوارا کرتے ہیں۔

باب سوم

نقطۂ نظر (مضامین)

فہرست مضامین

مضمون نویسی (ایک تعارف)

مضمون ایک ایسی نثری تحریر ہے جس میں بکھری صداقتوں اورنکھری لطافتوں یا مختلف مسائل حیات اورگوناگوں حقائق زندگی کو مدلّل، سادہ، مختصر اور دل نشین پیرایہ میں خاص ربط وضبط کے ساتھ رقم کیا گیا ہو۔ ہر صاحبِ دل و دماغ آدمی جو کچھ دیکھتا ہے اُس سے اثر بھی قبول کرتا ہے، اُسے بیان بھی کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے۔ مگر کم کم لوگ اپنے خیالات اور دیکھے سُنے واقعات کو تحریری صورت عطا کرتے ہیں اوّل اوّل مضمون نویسی کا مرحلہ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن کچھ ریاض کے بعد بات سمجھ میں آنا شروع ہو جاتی ہے۔ جو بھی اِس وادی میں قدم رکھتا ہے کامیاب ہو جاتا ہے۔ اب تو مضامین کی کئی قسمیں وجود میں آ چکی ہیں۔ اُردو اَدب میں شاید اس کا آغاز عہدِ سرسیّد میں رفقائے سرسیّد اور سرسیّد کی تحریروں میں باقاعدہ نظر آتا ہے۔ مقالاتِ سرسیّد کی اٹھارہ جلدیں اور شبلی کے مقالات کی کئی جلدیں اِس کی شہادت دیتی ہیں۔ سنجیدہ مضامین، سیرت نگاری، مزاحیہ مضامین، تاریخی مضامین، تنقیدی و تحقیقی اور سائنسی مضامین ہر نوعِ اُردو اَدب کے دامن میں پُر بہار ہے۔ گویا مضمون نثر کی ایسی صنفِ ادب ہے جو ہر عہد میں مقبول اور رواج پذیر رہی ہے۔ اِس کی درجہ بندی مقالہ، مضمون اور انشائیہ کی صورت میں کی جاتی ہے۔ تحقیقی وطویل تر مضمون مقالہ کہلاتا ہے۔ بے تکلفانہ اِنکشافِ ذات کا اِظہار اِنشائیہ جبکہ مدلّل، مختصر مدرسانہ اندازِ تحریر کو مضمون کا نام دیا جاتا ہے۔ ہر خیال کا اِظہار کسی نہ کسی زبان میں ہوتا ہے۔ افکار الفاظ کے سانچے میں ڈھلتے ہیں جب کہ افکار احساس و جذبات کے بطن سے نمودار ہوتے ہیں۔ ہر زبان میں مضامین لکھے گئے ہیں اور لکھے جاتے رہیں گے۔ ہر عہد کے تقاضوں کے پیشِ

نظریہ صنف ظہور پذیر رہے گی۔

ہمارے نصاب میں ابتدائی طور پر پرائمری جماعتوں سے لے کر اعلیٰ سطح کے امتحانات تک مضمون نویسی کی بڑی اہمیت ہے۔ درسی مضامین کی اپنی دنیا ہے۔ مختلف کتب میں مضامین نَو کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ طالب علموں کو مضمون نویسی کے لیے تمہید، نفسِ مضمون اور اختتام کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ تمہید مختصر اور دل چسپ ہو کیونکہ پہلا اثر آخر تک قائم رہتا ہے۔ نفسِ مضمون اِس کا جوہر ہے۔ عمدہ ترتیب اور خوب صورت ضبط بہت ضروری ہے۔ متعلقہ ضروری معاملات کو دلائل کے ساتھ بغیر تکرار کے پیش کر دیا جائے۔ چاہے مختصر ہو مگر خوب ہو۔ ناخوب سے دامن بچایا جائے۔ اختتام دراصل حاصل کلام ہے۔ بقول کسے: ''اِس میں نفسِ مضمون کا پورا جوہر اور عطر کشید ہو کر چند جملوں میں سمٹ آئے۔'' یہ اچھی مضمون نویسی کے لیے ایک مشورہ ہے۔ اس کا شخصیت کے ساتھ گہرا ربط ہے۔

محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

پوری انسانیت کی محسن صرف ایک ہی ہستی ہے۔خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

وہ دانائے سُبُل ،ختم الرُّسُل ،مولائے کُل جس نے

غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

درفشانی نے تری قطروں کو دریا کر دیا دل کو روشن کر دیا، آنکھوں کو بینا کر دیا

خود نہ جو تھے راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

اللہ تعالیٰ کی سُنت ہے کہ جہاں مخلوقات کو مادی ضروریات فراہم کرتا ہے وہاں انسانوں کی روحانی ضروریات کا بھی اہتمام فرمایا ہے۔انسانوں کی ہدایت کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبرانِ عظام مبعوث فرمائے۔اُن کے زمانے الگ الگ تھے۔کوئی کسی قوم کی طرف اور کوئی کسی بستی کی طرف۔ ہر عہد کی ضروریات مختلف اور تقاضے جدا جدا تھے۔ابتدا میں معاشرہ مختصر اور وسائل محدود تھے۔بدلتے لمحوں کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ آبادی میں اضافہ ہوتا گیا اور معاشرے کی ضروریات اور مسائل بھی لا محدود ہوتے گئے۔اب ایک ایسے عظیم الشّان رسول کی ضرورت تھی جن کا اُسوَہ کامل ہو، جن کی تعلیمات آفاقی، عالم گیر اور دائمی ہوں۔جن کی حیاتِ پاک بادشاہ ہو یا گدا، امیر ہو یا غریب، حاکم ہو یا محکوم، قاضی ہو یا گواہ، افسر ہو یا سپاہی، اُستاد ہو یا شاگرد، عابد ہو یا زاہد سب کے لیے کامل نمونہ ہو۔بقول سیّد سُلیمان ندوی: ’’یہ دنیا انسانی مزاجوں اور انسانی صلاحیتوں اور استعدادوں کے اختلاف کا نام ہے تو یقین کرو کہ محمد الرَّسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی جامع شخصیت کے سوا اِس کا کوئی آخری، دائمی اور عالم گیر راہنما نہیں ہوسکتا۔‘‘ اِرشادِ باری تعالیٰ ہے: ’’(اے پیغمبرؐ!) کہہ دیجیے اگر تمھیں خدا کی محبت کا دعویٰ ہے تو آؤ میری پیروی کرو، اللہ بھی تم سے محبت کرے گا۔‘‘ گویا اللہ کی محبت دعویٰ ہے اور اتباعِ رسولؐ دلیل دعویٰ۔اللہ

پاک کا احسان ہے اُس نے پیغمبرِ آخر الزّماں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مبعوث فرمایا اور بنی نوعِ انسان کی ہدایت کا ابدی سامان بہم پہنچایا۔

ہوئی ختم اُس کی حُجّت اِس زمیں کے بسنے والوں پر
کہ پہنچایا ہے اُن سب تک محمدؐ نے کلام اُس کا

اِرشادِ باری تعالیٰ ہے: ''لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْ مِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (ط) وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ○ (آلِ عمران 3:164) ترجمہ: بے شک مومنوں پر اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اُن ہی میں سے ایک رسول اُن میں بھیجا جو اُنھیں اُس کی آیتیں پڑھ کر سُناتا ہے اور اُنھیں پاک کرتا ہے اور اُنھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ یقیناً وہ سب اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

پیغمبرِؐ اسلام کی بعثت کے وقت شبِ ظلمت کا اندازہ کیجیے۔ اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کی ہر شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے، روشنی کی قدر شبِ تار سے ہوتی ہے۔ اُس وقت کی دنیا کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ہدایت کے چراغ بُجھ چکے تھے۔ کُرّہ ارض ایسا تھا جہاں ہدایت و راستی کا آفتاب نہیں چمکتا تھا۔ صحیح عقیدہ کہیں موجود نہ تھا۔ توحید کا نور اور اخلاص کی رو سے دنیا کا ذرہ ذرہ محروم تھا۔ مصر و یونان و روم میں اجرامِ فلکی کی خدائی تھی۔ ہر جگہ پتھر کی مورتوں اور مٹی کی صورتوں کے علاوہ سونے چاندی اور جواہرات کی پوجا ہوتی تھی۔ اخلاق کے تین معلّم رواقی، عیسائی اور بودھ مت کے پیروکار تجرّد، رہبانیت اور جوگی پن میں مبتلا تھے۔ الہامی مذاہب یہودیت اور عیسائیت کی تعلیمات کے اوراق خزاں دیدہ اور تحریف شدہ تھے۔ ایران میں دو خداؤں کے چرچے تھے۔ اللہ کے گھر میں 360 بُت تھے۔ ہر قبیلے کا اپنا بُت۔ ہندوستان بُتوں کی آماج گاہ تھا۔ یہاں تینتیس کروڑ معبودانِ باطلہ کی پرستش کی جاتی تھی۔ اقبال نے درست لکھا ہے:

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیوں کر

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا
قوتِ بازوئے مُسلم نے کیا کام ترا

قانونِ قدرت ہے کہ جب زمین پانی کے لیے پیاسی ہو جاتی ہے تو ربِّ کائنات آسمان پر بدلیاں بھیج کر، بارش برسا کر زمین کو حیاتِ نَو عطا کرتا ہے۔ ایسے ہی جب کشتِ انسانی ویران اور گمراہی میں بھٹک جاتی ہے تو اللہ پاک اُن کی ہدایت کا سامان کرتا ہے۔ چمنستانِ دہر میں بارہا ایسی روح پرور بہاریں آچکی ہیں۔ لیکن اب کی بار تو اُس ہستی کو تشریف لانا تھا جس کے لیے یہ بزمِ کونین سجائی گئی ہے۔ آپ تشریف لائے، بازارِ ہستی میں رونق آ گئی۔ ایوانِ کسریٰ کے 14 کنگرے گر گئے۔ آتش کدۂ فارس بجھ گیا۔ دریائے سادہ خشک ہو گیا۔ بقول شبلی نعمانی: ''سچ تو یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ ہی نہیں، بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتش کدۂ فارس ہی نہیں بلکہ جحیم شر، آتش کدۂ کفر آزر کدۂ گمراہی بھی سرد ہو کر رہ گئے۔ صنم خانوں میں خاک اُڑنے لگی۔ بت کدے خاک میں مل گئے۔ مجوسیت کا شیرازہ بکھر گیا۔ نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اُٹھا، چمنستانِ سعادت میں چُپکے سے بہار آ گئی۔ آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں۔ دیوانے فرزانے دامن توحید سے وابستہ ہوئے۔ فکرِ انسانی مہک اُٹھی۔ دشمن دوست بن گئے۔ جاں نثاروں کی ایک صالح اور پاکیزہ جماعت وجود میں آئی جسے چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ غارِ حرا کے اُجالے چارسُو پھیل گئے۔ خلوتیں جلوتوں میں بدل گئیں۔

گھٹا اِک پہاڑوں سے بطحا کے اُٹھی پڑی چارسُو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور دمک دور دور اُس کی پہنچی جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

یہ تھا وہ عالم گیر انقلاب جو محسنِ انسانیت کی نگاہِ کیمیا رس کا اثر تھا۔ آپؐ کی رحمت و رافت کے سائے، آپؐ کے لُطف و کرم کی سعادتیں، انسان کو شستگی، شائستگی اور خودداری کا سبق پڑھایا۔ تہذیب و تمدن،

فکرونظر آپؐ کے شرمندۂ احسان ہیں۔ اپنے اشکوں سے دین کی کھیتی کو سیراب فرمایا اور اپنے فاقوں سے دہر کو سروسامان عطا کیا۔ دونوں جہاں کی رونقیں آپؐ کے حُسن کی زکوٰۃ ہیں۔

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب

آپؐ کے احسانات کی جھلک حالیؔ کی زبانی سُنیے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی برلانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ یتیموں کا والی، غلاموں کا مولا
خطا کار سے درگزر کرنے والا بداندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اُتر کر حِرا سے سُوئے قوم آیا اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مس خام کو جس نے کُندن بنایا کھرا اور کھوٹا الگ کر دِکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا پلٹ دی بس اِک آن میں اُس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
ادھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

یہ وہ معجزانہ انقلاب تھا جو محسن انسانیتؐ نے برپا کیا۔ عورتوں کے حقوق متعیّن کیے۔ غلاموں کو آزادی اور برابری کا پیغام سُنایا۔ امیروں اور خلفاء کو فقیرانہ طرزِ زندگی کا درس دیا اور تہی دستوں کو غیرت وحمیت کا سبق پڑھایا۔ آخری خطبے میں تمام انسانوں کی آبرو، جان اور مال کی حفاظت کا ذمہ دار ہر اُمتی کو ٹھہرایا۔ ایسا احترام جیسا بیت اللہ، مکہ مکرمہ اور یومِ حج کا ہے۔

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اِک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

مولانا ظفر علی خان

بلکہ

تاریک شب میں آپؐ نے رکھا جہاں قدم مہتابِ نقشِ پا سے وہاں روشنی ہوئی

ابوالکلام آزاد

فکر نارسا ہے اور قلم آبلہ پا۔ آپؐ کے احسانات کا شمار ممکن نہیں ۔ ہر فکر اپنے انداز میں، ہر طبقہ اپنی سوچ اور ہر انسان اپنے ظرف کے مطابق بیان کا اعزاز حاصل کرتا رہے گا تا ابد۔ اوصافِ حمیدہ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

عالم ناسوت میں اور عالم لاہوت میں کوندتی ہے ہر طرف برقِ جمالِ مصطفیٰؐ
ذرہ ذرہ عالم ہستی کا روشن ہو گیا اللہ اللہ شوکت و شانِ جمالِ مصطفیٰؐ

اصغر گونڈوی

محسن انسانیت محمد الرّسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے طفیل 23 برس کی مدت میں ایک متحدہ سلطنت، ایک متحدہ اخلاقی نظام، ایک کامل قانون، ایک مکمل شریعت، ایک ابدی مذہب اور عملی جماعت، خدا پرستی، اخلاق وایثار، تدین، تقویٰ، ایمان داری، اخلاق اور سچائی کا ایک مجسم عہد یعنی ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان پیدا ہو گیا اور گویا یہی حقیقت تھی جس کی طرف آپؐ نے اُمّت کے سب سے بڑے اجتماع (حجۃ الوداع) میں اپنی وفات کے تقریباً تین ماہ پیشتر بلیغ ارشادات فرمائے تھے۔

☆☆☆☆☆☆

اِتّحادِ عالَمِ اِسلام

وحدت میں قوّت ہے اور قوّت میں حفاظت ہے۔ قطرہ قطرہ مل کر قلزم بنتا ہے اور ذرہ ذرہ مل کر صحرا۔ آشیاں سازی کے عمل میں تنکا تنکا جمع کیا ہوتا ہے۔ پرندوں کے اُڑتے غول اور ڈاریں اتحاد کی مظہر ہیں۔ کیا خوب بات ہے: "Union is Strength" اتفاق میں برکت ہوتی ہے یا ایک ایک دو گیارہ۔ اقبالؒ نے فرمایا:

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے۔ اتحاد وہ نسخۂ کیمیا ہے جو قوموں کی ترقی، خوشحالی اور آزادی کا سبب ہے۔ اُمتِ مسلمہ کی تاریخ شاہد ہے کہ جب تک اُن میں اخوّت کا رشتہ قائم تھا، وہ حلقۂ یاراں میں بریشم کی طرح نرم اور رزمِ حق و باطل میں فولاد کی طرح سخت رہے۔ وہ ''کُلَّ الْمُؤمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ'' کی کامل تصویر تھے۔ اُن میں ہر طرح کی خوبی تھی۔ کُرّۂ ارض پر اُن کے چرچے تھے۔ اغیار اُن کے سامنے سرنگوں تھے۔ اُنھوں نے دنیائے عالم کو علوم پڑھائے، فنون سکھائے۔ تہذیب و تمدن، شان و شوکت، رفعت و منزل، عظمت و سطوت اور اقتدار نے اُن کے قدم چومے۔ روما کی سلطنت، ایران کی بادشاہت، اُندلس کی حکومتیں اُن کے سامنے سرنگوں ہو کر حلقہ بگوشِ اِسلام ہوئیں۔ وہ صحرائے عرب شُتربانوں کا گھوارہ، تمدّن آفریں اور خلّاقِ آئینِ جہاں داری بنے۔ مدینہ کی ریاست کے قیام کے آغاز میں پیغمبرِ آخرالزّماں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سب سے پہلے انصار اور مہاجرین کے مابین اخوت کا رشتہ قائم کر کے اخوتِ انسانی کی وہ مثال پیش کی جو چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ پھر اُن کی مثل

انصار کا ایثار اور مہاجرین کی خود داری کی نظیر تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ہر طرح کی ذات پات کی نفی، رنگ و نسل کے تمام جھگڑے ختم۔ صرف تقویٰ معیار قرار پایا، جس کی بنیاد **لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ** تھی۔

از سرِ نو کیا گیا دودۂ آدم ارجمند
اُٹھ گئی قیدِ خون و رنگ، مٹ گیا فرقِ نسل و ذات

یہ تھا اخوت کا ماحول جس میں کسی عربی کو عجمی اور عجمی کو عربی، کالے کو گورے اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں تھی۔ سب کے پیشِ نظر ایک قرآن، ایک رسول اور ایک قبلہ تھا۔ یعنی امام ابوحنیفہؒ کے بقول: ''کسی اہلِ قبلہ کو کافر نہ کہو'' پر قائم تھے۔ وہ بہترین معاشرہ تھے جس کا نام اُمّت ہے۔ اُن کا ایمان ایک اور ہدف مشترک تھا۔ اِس اُمّت کا امتیاز تھا کہ وہ ترکیب میں خاص ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ:

اپنی مِلّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولؐ ہاشمی

حضورؐ کا اِرشادِ پاک ہے: ''اُمتِ مسلمہ ایک جسمِ واحد کی مانند ہے۔ جب کوئی عضو بیمار ہوتا ہے، پورا جسم درد محسوس کرتا ہے۔''

اخوّت اِس کو کہتے ہیں چُبھے کانٹا جو کابُل میں
تو ہندوستاں کا ہر پیر و جواں بے تاب ہو جائے

اللہ کے رسولؐ کا فرمان ہے کہ ''میں تمھارے درمیان دو چیزیں کتاب اور سُنّت کو چھوڑے جا رہا ہوں۔ جب تک اِن پر کاربند رہو گے سرخرو رہو گے۔'' جب سے امتِ مسلمہ نے اس ''عُروَۃِ الوُثقیٰ'' کو چھوڑا ہے، ذِلّت و نکبت اس کا مقدّر بن گئی۔ لالچ، ہوس، جہالت اور اقتدار کی خواہش نے ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ مغرب کے دانش

وروں نے اُمتِ مسلمہ کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔ڈالر کی چکا چوند اور اقتدار کی ہوس نے امتِ مسلمہ کو فرقہ بندی، ذات پات اور جغرافیائی حد بندیوں میں محصور کر دیا ہے۔

مختار مسعود نے کتنی فکر انگیز بات کی تھی: ''بیسویں صدی میں اُمّتِ مسلمہ کو دو بڑی نعمتیں عطا ہوئیں۔ایک تیل کی دولت اور دوسری آزادی کی نعمت۔مگر نفاق و انتشار اور عدم اتحاد کے سبب دونوں نعمتیں نقش بر آب ثابت ہوئیں۔ہمارے پاس تیل کے چشمے بھی ہیں اور سر چشمے بھی،مگر چراغ جلانے کو تیل نہیں ہے۔''

اِقبال نے واضح طور پر اِس کا نقشہ پیش کیا ہے:

منفعت ایک ہے اِس قوم کی،نقصان بھی ایک　　ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی ، اللہ بھی ،قرآن بھی ایک　　کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

حالیؔ کی فریاد بہت درد بھری ہے:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے　　اُمت پہ تِری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے　　پردیس میں آج غریب الغربا ہے

پورا عالمِ کُفر جمع ہے۔نیٹو ممالک ملتِ اسلامیہ کے خلاف متحد ہیں۔رومیؔ کے لالہ زاروں میں بدحالی ہے۔عراق تباہ حال ہے۔شام میں خونِ مسلم کی ارزانی،لیبیا خانہ جنگی کا شکار،افغانستان کئی سال سے حالتِ جنگ میں اور کشمیر لہولہو ہے۔

گھر سے تا درِ زنداں اور وہاں سے مقتل تک
ہر ایک راہ سے تِرے جاں نثار گزرے ہیں

فلسطینیوں کی فریادیں اور بوسنیا کے مسلمانوں کے علاوہ برما کے مظلوموں کی فلک شگاف آہیں او۔آئی۔سی سے عالمِ اِسلام کے اتحاد کا مطالبہ کر رہی ہیں۔فطرت کا اصول ہے جو اپنی حفاظت خود نہ کر سکے دوسرے اُس کی حفاظت کیوں کریں۔کیا خوب پیغام ہے:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

احساسِ محرومی یا احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔علاج اور درماں ضروری ہے۔ہمارے پاس معدنی وسائل کی فراوانی ہے۔افرادی قوت کی کثرت، گرم پانیوں کا تصرّف، بڑی بڑی شاہرات، وادیِ سندھ کی پرانی تہذیب کے وارث، دجلہ و فرات کی وادیاں اور میدان، بلند و بالا پہاڑ، ہر طرح کا موسم، ذہین افراد کی بہتات، لہلہاتی وادیاں سب سے بڑھ کر خدا تعالیٰ کی نصرت کا وعدہ اور رسولؐ اللہ کی سنہری تعلیمات۔مگر ضرورت اتحاد، اتفاق اور محبت۔

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مِٹ جانے سے　　تشنۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے　　پاسباں مِل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تُو ہے
عصرِ نو رات ہے، دھندلا سا ستارہ تُو ہے

پھر کہا:

تہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا　　شاید کرہ ارض کی تقدیر بدل جائے

ہماری بہتری کی اگر کوئی تدبیر ہے تو "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا" کے ابدی پیغام میں ہے۔یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامو اور تفرقے میں نہ

پڑو۔

یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی   تو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بے کراں ہو جا

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوّت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

اگر ہم ایک ملت میں گم ہو جائیں، ہر قسم کے اختلافات کو دین کی روشنی میں ختم کر لیں، ذات سے بالا تر ہو کر وحدتِ ملت کا راستہ اپنا لیں تو ہماری عظمتِ رفتہ، کھویا ہوا نشیمن، چھنا ہوا وقار ہماری راہ دیکھ رہا ہوگا۔

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے   تُو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

طاغوتی طاقتیں ہمارے درپے ہیں۔ انھوں نے سوشلزم کو شکست دے دی ہے۔ شیطان ہمارے خلاف سینہ سپر ہے۔ ان کا اگلا ہدف اسلام اور مسلمان ہیں۔ آئے دن اُن کی حرکات اس پر شاہد ہیں۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہمارے اکابرین، اہلِ فکر و نظر اتحاد کی فضا قائم کریں۔ یہی ''فوز العظیم'' ہے۔

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تُو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

☆☆☆☆☆☆

کرونا(COVUD-19)اور حفاظتی تدابیر

کرونا ایک دردناک اور فی الوقت ایک لاعلاج بیماری ہے۔ بیماری اور انسان کا ازل کا ساتھ ہے۔لیکن ہر بیماری جان لیوا نہیں ہوتی۔ انسان کو وقتاً فوقتاً طرح طرح کی آفات کا سامنا ہوتا ہے۔''موت بیماری سے نہیں، قضا سے آتی ہے۔''

بجلیاں ہیں ، زلزلے ہیں ، قحط ہیں ، آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایّام ہیں

اور انسان حفاظتی تدابیر کے ذریعے اُن سے نبرد آزما رہا ہے۔ بلند حوصلگی کے باعث اِن آفات پر غالب آتا رہا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ بعض بیماریاں یا آفات عذاب کی صورت اختیار کر جاتی رہی ہیں اور بگڑی قوموں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیتی رہی ہیں۔قومِ عاد و ثمود کے قصے،''آلِ فرعون کی تباہی کے واقعات، بابل اور نینوا کی تہذیب کی بربادی کے تذکرے اور وادیِ سندھ کی تہذیب کے مٹتے آثار''ہڑپہ اور موہنجو داڑو کی صورت میں آج بھی نشانِ عبرت ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ اُن کے پاس علم نہیں تھا یا وہ علاج کے طریقوں سے واقف نہیں تھے۔مذکورہ بالا تہذیبیں ہر سہولت سے آراستہ تھیں۔ترقی کی منازل طے کر چکی تھیں مگر جب وہ خدا فراموش ہو جاتی ہیں،حرص و ہوا میں خودی سے بڑھ جاتی ہیں تو گویا وہ عذابِ الٰہی کو دعوت دیتی ہیں۔ خدا کی غیرت جوش میں آ کر اُنھیں حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتی ہے۔ ایسے ہی ترقی اور معلومات کے اِس عہد میں کرونا COVID-19 کا پھیلاؤ انسان کی بے بسی کا مظہر ہے۔اس کے عاجز پن کا ماتم اور خدائے پاک کی وحدت اور عظمت کا ثبوت ہے۔بعض احباب کا کہنا ہے کہ یہ امیروں کی بیماری ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جہازوں پہ سفر کرنے والوں کو متأثر کرتی ہے۔ یہ شہروں میں زیادہ اور دیہات کو کم متأثر کرتی ہے۔غرض جتنے مُنہ اُتنی باتیں۔

آئیں! سائنسی تحقیق اور ماہرین کی آرا سے دیکھیں کہ یہ بیماری کیا ہے؟ اِس کا ہدف کیا ہے؟ اور اِس سے بچاؤ کی تدابیر کیسے ممکن ہیں؟

کرونا وائرس ، وائرسز (viruses) کا ایک ایسا گروپ ہے جو انسانوں اور پرندوں میں سانس کی بیماری پیدا کرتا ہے۔ یہ بیماری علامات کے لحاظ سے مختلف لوگوں میں مختلف ہوتی ہے۔ زیادہ تر لوگ علامات ظاہر ہوئے بغیر (Asymptomatic) بیماری میں مبتلا ہو کر صحت یاب ہو جاتے ہیں جن کا تناسب اندازاً 80 فیصد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی مما لک خصوصاً پاکستان میں عوام النّاس اِسے بیماری ہی نہیں مانتے۔ ''لیکن جس گھر میں آگ لگے وہی جانے۔'' ''جس تن لاگے سوتن جانے۔

کرونا وائرس کا نام لاطینی زبان کے لفظ "Corona" سے ماخوذ ہے۔ جس کا مطلب "crown" یعنی تاج کے ہیں۔ کیوں کہ الیکٹران مائیکرو ایکسرے (Electron micro exray) سے مشاہدے میں اس کی شکل تاج جیسی ہوتی ہے۔ اِس کی سطح سے سپائکز (Spikes کی صورت میں پروٹین (Proteins) موجود ہوتے ہیں۔ موجودہ وبا (Pandamic) میں اِسی کرونا وائرس فیملی (Corona Virus Family) ہیومن کرونا وائرس (Human Corona Virus)"SARS-Cov-2" ذمہ دار ہے۔ کرونا وائرس کا آغاز دسمبر 2019ء میں چین کے شہر ووہان (Wuhan) سے ہوا تھا۔ یو۔این۔او (U.N.O) کے اِدارے "W.H.O" اِس وبا کو جنوری 2020ء میں عالمی سطح کی ہنگامی عوامی بیماری (Public Health Emergency of International Concern) قرار دیا ہے۔ مارچ 2020ء میں اِسی اِدارے نے اِسے وبائی مرض (PANDAMIC) قرار دیا تھا۔ 28 نومبر 2020ء (جب یہ سطور لکھی جا رہی ہیں) تک 6109 ملین سے زیادہ افراد اِس بیماری میں مبتلا ہو چکے ہیں اور 1.44 ملین سے زیادہ افراد اِس خوف ناک بیماری سے لُقمۂ اجل بن چکے ہیں۔ اِس وائرس کے پھیلاؤ کے کئی رنگ ہیں۔ یہ کئی صورتوں میں پھیل سکتا ہے۔ سرِفہرست تھوک اور

جسم کی رطوبتیں ہیں۔ یہ آبی بخارات کی صورت اِختیار کر کے ہوا میں معلق ہو جاتے ہیں۔جب کرونا کے مرض میں مبتلا شخص سانس لیتا، کھانستا، چھینکتا، گاتا یا بولتا ہے تو اس کے اِن افعال کے سبب دوسرا صحت مند شخص متأثر ہو کر مرض کا شکار بن جاتا ہے۔ایسے یہ زود اثر بیماری تیزی سے لوگوں میں پھیلتی جاتی ہے۔ یہ وائرس آلودہ سطحوں (Fomites)اور میوکس میمبرین (Mucus Membrane) کے ساتھ ڈائریکٹ کنٹیکٹ (Direct Contact) سے بھی پھیلتا ہے۔ یہ وائرس ایک سے دوسرے میں علامات ظاہر ہونے سے دو دِن پہلے بھی منتقل ہوسکتا ہے۔اور جن اشخاص می علامت ظاہر نہ بھی ہوں وہ بھی اِسے پھیلانے کا باعث بن سکتے ہیں۔معمولی علامات والے مریض دس دن تک اور شدید علامات والے مریض دو ہفتوں تک یہ وائرس دوسروں تک منتقل کر سکتے ہیں۔ 1

علامات کے بارے میں انکشاف ہوا ہے کہ بخار، کھانسی، تکان کے علاوہ ذائقوں اور سونگھنے کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔یعنی پہلے قوتِ شامہ اور ذائقہ کو متأثر کرتی ہے، بعد میں سانس میں دشواری کا باعث بنتی ہے یہ بگڑ کر پھیپھڑوں میں وائرس منتقل ہونے کے بعد 14- 10 علامات ظاہر ہو سکتی ہیں اور پیچیدگیاں پیدا کرسکتی ہیں جن میں نمونیہ (pneumonia) اور اے۔آر۔ڈی۔ایس (A.R.D.S) شامل ہیں۔

یوں تو ضرب المثل مشہور ہے کہ ''پرہیز علاج سے بہتر ہے۔'' ابھی تک اِس بیماری کا کوئی علاج دریافت نہیں ہو سکا اور نہ ہی اس کے لیے کوئی ویکسین (Vaccine) تیار ہوسکی ہے۔احتیاطی تدابیر اختیار کرنے سے بچاؤ ممکن ہے۔حفاظتی تدابیر مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ سماجی فاصلہ (Social Distance)

۲۔ ماسک کا استعمال

۳۔ کھلی فضا اور ہوادار ماحول (Ventilation and air-filtering)

۴۔ سینیٹائزر کا استعمال

۵۔ ہاتھوں کا بار بار دھونا کم از کم 20 سیکنڈ تک۔

۶۔ کھانستے ،چھینکتے وقت منہ کو ڈھانپنا۔

۷۔ آنکھ، ناک اور منہ کو چھونے سے احتراز کرنا۔

۸۔ سطحوں کی جراثیم کُشی (disinfect) کرنا۔

۹۔ مریض اور مریض سے ملنے والے افراد کا خلوت گزین (Self Isolate) ہونا۔قرنطینہ کرنا۔(Corintine)

یہ تو وہ حقائق تھے جو ویب سائٹ (Website) پر دیکھے اور پڑھے جاسکتے ہیں۔پھر گاہے گاہے بازخواں کے طور پر پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کے واسطے سے ماہرین طب، ڈاکٹر صاحبان اور سربراہانِ اِدارہ کی زبانی سُنے جاسکتے ہیں۔مگر عالم کا بھی عجب عالم ہے۔امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ چین کو اِس بیماری کا سبب جانتا رہا۔کچھ ممالک اِسے اسرائیل کی حکمتِ عملی یا شرارت کا نام دیتے ہیں۔اہلِ چین کا کہنا ہے کہ یہ بیماری ہمارے ہاں ہندوستان سے پانی کے ذریعے آئی ہے۔کچھ بھی ہو بڑی مخصوص قسم کا مرض ہے۔ترقی یافتہ ممالک خصوصاً اِس کی زد میں ہیں۔امریکہ، برطانیہ، اٹلی، فرانس وغیرہ پر لرزہ طاری ہے۔جو سوچتا ہے خوف زدہ ہو جاتا ہے۔پہلی لہر پر تو پاکستان اور اسلامی دنیا میں عبادات نماز، نماز تراویح، جمعہ اور عیدین وعمرہ میں انتہائی حفاظتی تدابیر اپنائی گئیں اور اب بھی جاری ہیں۔نصرتِ خداوندی کے بغیر چارہ نہیں۔وہی شفا دیتا ہے۔ہوالشافی۔قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ کا اِرشاد ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ o الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ o

ترجمہ: ”اور ہم تمھیں ضرور خوف وخطر، فاقہ کشی، جان ومال کے نقصانات، پھلوں کی بربادی (آمدنیوں میں کمی) کرکے تمہاری آزمائش کریں گے۔اور اُن لوگوں کو خوش خبری سنا دیجیے جو لوگ مصیبت پڑنے پر صبر کریں گے اور کہیں گے کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اُسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

تعلیمِ نسواں

تعلیمِ نسواں دو الفاظ کا مجموعہ ہے۔ گرامر کے لحاظ سے یہ مرکب اضافی ہے۔ معنی عرفِ عام میں سیکھنے سکھانے کے ہیں۔ گو یا تعلیم سیکھنے سکھانے کا عمل ہے۔ جبکہ نسوان عربی زبان کا لفظ ہے جو نساء کی جمع ہے اور اُردو میں اِسے عورتیں، عورتوں یا مستور کہا جاتا ہے۔ اب ذرا تفصیل سے دیکھنا ہوگا کہ تعلیم کیا ہے اور اور عورتوں کے لیے کیوں ضروری ہے؟

تعلیم کا زیور انسانیت کے ماتھے کا جھومر ہے۔ تعلیم ایک مسلسل عمل ہے جو ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔ یہ قوموں کی زندگی میں تہذیب کا باعث ہے۔ یہ تمدّن کا سفر ہے۔۔ یہ علم کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ عقیدے کی درستی کا سبب ہے۔ اِس کے ذریعے سے فنون بھی سیکھے جا سکتے ہیں اور مہارتیں بھی۔ تعلیم تربیت بھی کرتی ہے اور اقدار کی پاسداری بھی سکھاتی ہے۔ یہ عمل بچے کی پیدائش سے شروع ہو کر موت تک جاری رہتا ہے۔ جبھی تو پیغمبرِ آخرالزّماں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا تھا: ''ماں کی گود سے لحد تک علم حاصل کرو۔ پھر فرمایا: تم میں سے بہتر وہ ہے جو خود قرآن سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔ بابائے عمرانیات ابنِ خلدون کے بقول تعلیم ایک صنعت ہے۔ ہر فرد کی دوسرے سے مختلف ہوگی۔ یہ روحِ انسانی کی بالیدگی اور معاشی ترقی کا باعث ہے۔ امام غزالی معاد اور معاش دونوں کی تعلیم کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ میرے نزدیک تعلیم فرض کفایہ نہیں بلکہ فرضِ عین ہے۔ پیغمبرؐ اسلام نے فرمایا: ''علم حاصل کرو چاہے اُس کے لیے تمھیں چین جانا پڑے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ''طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَ مُسْلِمَۃٍ۔ یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ اِتنی ضروری، نفع بخش اور ناگزیر شے یا امر سے عورتوں کو محروم کیسے رکھا جا سکتا ہے۔'' عورت نصف انسانیت ہے۔ اگر اسے تعلیم کے حصول اور جوہر سے محروم رکھا گیا تو گویا نصف انسانیت تہذیب و تمدن، علوم و فنون، روحانی اور معاشی ترقی، عقائد اور اقدار کی پاسداری، اعلیٰ اخلاق و کردار سے تہی

دامن اور معاملاتِ زندگی کے گیسو سنوارنے سے محروم رہ جائے گی۔کہا جاتا ہے کہ مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ زندگی میں ایک دوسرے کے معاون اور مددگار۔ اگر گاڑی کا ایک پہیہ ناقص یا خراب ہوگا تو زندگی کی گاڑی کا چلنا محال اور ناممکن بھی ہو جائے گا۔

بعض مغربی مبصرین کی رائے کے مطابق: ''مردی کی تعلیم ایک فرد کی تعلیم ہے۔ جب کہ عورت کی تعلیم ایک خاندان کی تعلیم ہے۔'' ویسے بھی متوازن زندگی گزارنے کے لیے زندگی کی گاڑی کے دونوں پہیوں میں توازن ضروری ہے۔جس معاشرے کا ایک حصہ بے کار اور اُس کی زندگی بے مصرف ہوگی تو وہ معاشرہ صحت مند نہیں بلکہ اپاہج کہلائے گا۔ترقی کا عمل اور سعادت کا سفر ممکن نہیں رہے گا۔ایسا معاشرہ معذور اور بے بس ہوتا ہے۔

کنفیوشس چینی رہنما (551 ق۔م) جسے ہم حکیم الحکماء کا درجہ دیتے ہیں، وہ معاشرے کی اصلاح اور فلاح کے کام کا آغاز فرد سے کرتا ہے۔ چونکہ فرد معاشرے کی بنیادی اکائی ہے اور عورت بھی ایک فرد ہے۔فرد سے مل کر معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔وہ کامیاب معاشرے کے پانچ رابطوں کی بات کرتا ہے: باپ کے اندر محبت و شفقت، بیٹے میں احترام و تکریم، بڑے بھائی میں شرافت اور چھوٹے میں انکسار، شوہر کو راست باز اور بیوی کو اطاعت شعار، بڑوں کو غور و خوض اور چھوٹوں کو ادب کرنا چاہیے۔حکمرانوں میں خیر اندیشی اور عوام میں وفاداری ہونی چاہیے۔ہم بات کر رہے تھے معاشرے میں عورت کی اہمیت اور افادیت کی: فرانس کے مشہور حکمران نپولین کا قول ہے: ''آپ مجھے تعلیم یافتہ مائیں دیں میں آپ کو بہترین قوم دُوں گا۔''

اُنیسویں صدی عورت کی صدی کہلاتی تھی اور بیسویں صدی بچے کی صدی کہلاتی ہے۔ تمام اہلِ بصیرت اِس امر پر متفق ہیں کہ بچے کی شخصیت ایک مقدس امانت ہے جس کی نگہداشت میں کوتاہی افراد اور اقوام کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ اِس امانت کی ہمدردانہ حفاظت کرنے والی دو ہستیاں ہوتی ہیں، ایک ماں اور دوسرا اُستاد۔ اور اُستاد کے روپ میں پھر نصف حصہ عورت ہی کا ہے۔ دونوں کے قلب و نظر کی قندیل کی روشنی میں ایک منزل نا آشنا ہستی سفر کا آغاز کرتی ہے۔ننھی سی

جان پہلے ماں کی لوریاں سُنتی ہے اور توانا ہو کر اُستاد کی صحبت اختیار کرتی ہے۔ ماں کی آغوش میں نبوت بھی پلتی ہے اور امامت اور ولایت بھی، شہدائے وطن بھی اور صلحائے ملت بھی، نامور شعراء بھی اور سیاست کے میدان کے بطلِ جلیل بھی، غازیاں بھی اور واعظین وصالحین بھی۔ جب بڑے پادری نے چھوٹے پادری سے سوال کیا کہ حضرت مریم کا تعارف کروائیں تو اُس نے پیٹی کھول کر باندھی اور مؤدب ہو کر جواب دیا: ''فادر! حضرت مریم کا اس سے بڑھ کر اور کیا تعارف ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ ہیں۔''

تاریخِ انسانیت کے آغاز سے مرد اور عورت کا ساتھ، ساتھ ساتھ ہے۔ جنت میں حضرت آدمؑ کو جب تنہائی کا احساس ہوا تو ربِّ جلیل نے امّاں حوا کو پیدا کر دیا۔ گویا کائنات عورت کے وجود کے بغیر نامکمل اور ادھوری ہے۔ زندگی کے سارے حُسن اس کے وجود سے وابستہ ہیں۔ بقول اقبال:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اِسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

حالیؔ پانی پتی پکار اُٹھتا ہے: ''اے ماؤ، بہنو، بیٹیو! دنیا کی زینت تم سے ہے۔ دین سلامت تم سے ہے۔ جینے کی حلاوت تم سے ہے۔ تمھارے بن چمن ویرانہ ہے، تم غم زدہ دلوں کی ڈھارس ہو۔''

ترکی شاعر ضیا نے اِن الفاظ میں عورت کے وجود کو اور اُس کی حیثیت، مرتبہ اور مقام کو بیان کیا ہے: ''اور پھر عورت ہے میری ماں، میری بہن، میری بیٹی۔ یہ عورت ہی تو ہے جس کی بدولت میری زندگی کی گہرائیوں سے مقدس ترین آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ میری محبوبہ (رفیقۂ حیات) ہے۔ میرا آفتاب، میرا ماہتاب، میرا ستارہ۔ اُس نے مجھے زندگی سے آشنا کیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مقدس قانون اس حسین و جمیل مخلوق کو قابلِ نفرت ٹھہرائے۔''

جب تک عورتوں کی صحیح قدر و قیمت کا احساس نہیں ہوگا حیاتِ مِلّی نامکمل رہے گی۔ اُستاد مطہری (ایرانی دانش ور ''مسئلۂ حجاب'' اور اس جیسی آٹھ کتابوں کا مصنف) کے نزدیک مسئلۂ حجاب کا حاصل یہ ہے کہ پردہ کے نام پر عورت کو عمر قید کی سزا مت سناؤ۔ نہ حبس، نہ اختلاط بلکہ حریم۔ عورت کو

حرمت وعزت دو۔اس کی حمایت اور دِفاع کرو۔

عورت کی حیثیت، اُس کے مقام، اُس کے دائرۂ کار سے کسی فرد کو انکار نہیں۔ یہ تو مغربی پادریوں کے پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے کہ اسلام عورت کی تعلیم کے حق میں نہیں یا اسلام عورت کی تعلیم پر پابندی عائد کرتا ہے۔ایسا ہرگز نہیں۔دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں خواتین نہ ہوں۔بعثتِ نبویؐ سے پہلے قریش میں صرف سترہ پڑھے لکھے لوگ تھے تو اُن میں ایک شفا بنت عبداللہ بھی تھیں۔حضرت خدیجہؓ جاہلی معاشرے میں طاہرہ کے لقب سے پکاری جاتی تھیں ایک مالدار اور متموّل خاتون۔جس کا سامانِ تجارت بصریٰ کے بازاروں میں فروخت ہوتا تھا۔اُن کی دینی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں۔ آپؓ عورتوں میں اسلام قبول کرنے والی پہلی خاتون تھیں۔ہجرت کے موقع پر حضرت اسماءؓ بنتِ ابی بکرؓ کی خدمات۔مدینہ آمد پر مدینہ کی بچیاں دف بجا بجا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا استقبال کرتی ہیں

غزوۂ اُحد کے موقع پر کفار کی 14 عورتیں اور مسلمانوں کی طرف سے حضرت فاطمہؓ بنتِ رسولؐ، حضرت عمارہؓ، حضرت اُمِّ سلیمؓ اور حضرت صفیہؓ کی شرکت عورتوں کی بہادری اور جاں نثاری کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔غزوۂ خندق کے موقع پر حضرت صفیہؓ کا یہودی کا سرتن سے جدا کر کے پھینکنا اُن کی ''مردانہ وار'' بہادری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

تمام علمائے حدیث کا اتفاق ہے کہ حضرت عائشہؓ کی مرویات (روایاتِ حدیث) کا اُن سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا۔حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن محمد کو خط لکھا کہ عمرہ کے مسائل اور روایات قلم بند کر کے بھیج دیں۔

مغرب کے غلط پروپیگنڈا کو کیسے تسلیم کرلیا جائے۔جب کہ قرآن پاک کی دوسورتوں کے نام ''سورۃ النّساء'' (۱۷۶ آیات) اور سورۃ مریم (۹۸ آیات) عورتوں کے نام پر ہیں۔قرآن میں ہر مومن کو کہا گیا ہے کہ اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ۔قرآن پاک میں امّاں حوا سے لے کر حضرت موسیٰ کی والدہ اور اہلیہ کا بھی ذکر ہے۔بدبخت فرعون کے گھر میں بی بی آسیہ کا ذکر، حضرت یوسفؑ

کے حرم زُلیخا کا ذکر، حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بریّت کا ذکر اور حضرت سُلیمانؑ کے عہد میں ملکہ سبا کا تذکرہ اور اُن کے حضرت سلیمانؑ پر ایمان لانے کا واقعہ بھی موجود ہے۔

عہدِ نبویؐ میں عورتوں کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام تھا۔ مسجد نبویؐ کا باب النساء اِس پر آج بھی شاہد ہے۔ اُن کی تعلیم کے لیے بُدھ کا دن مقرر تھا۔ قرآنِ پاک میں یَا اَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (اے ایمان والو) کے مخاطب صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی ہیں۔ بلاغت کا اصول ہے، مفعول کے بغیر خطاب عوام سے ہوتا ہے۔ دین کے جملہ مسائل اوامر ونواہی، عبادات عورتوں پر بھی ایسے ہی فرض ہیں جیسے مردوں پر۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے عہد میں جب تدوین حدیث کا مرحلہ پیش آیا تو عمرہ بنتِ عبدالرّحمن (جو عالمہ، محدّثہ اور قاضیہ تھی، حضرت عائشہ صدیقہؓ کی سرپرستی میں پلی بڑھی تھیں) کے نسخہ کو قابل اعتبار مانا گیا۔ عہدِ نبویؐ میں راویانِ حدیث میں بہت سی صحابیات اور امہات المومنین کے نام بھی ہیں۔ اُن میں سے سب سے زیادہ احادیث جن کی تعداد ۲۲۱۰ ہے، حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہیں۔ برّصغیر پاک وہند میں رضیہ سلطانہ اور بیجاپور کی چاند بی بی سے کون واقف نہیں۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں فاطمہ بنت عبداللہ کو علامہ اقبال نے:

فاطمہ تو آبروئے اُمّتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مُشتِ خاک کا معصوم ہے

کہہ کر خراجِ تحسین پیش کیا۔

کتابِ زندگی کے چاروں سنہری ابواب سجانے کی عورتیں بھی اُتنی ہی مکلّف ہیں جتنے مرد، بلکہ ان کے بغیر یہ ابوابِ زندگی (عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات) نامکمل اور ادھورے ہیں۔ البتہ اسلام ہر طبقۂ فکر کا دائرۂ عمل اور دائرۂ کار متعین کرتا ہے۔ جسے مغربیوں نے زیبِ داستان بنایا ہوگا۔ دنیا اختلافِ عمل کا نام ہے۔ ہر آدمی ہر ایک کام نہیں کرسکتا۔ یہی معاملہ اصناف کا ہے۔ مرد کفالت کرتا ہے اور عورت پرورش۔ مغرب نے اس پر معاشی ذمہ داریاں ڈال کر اس سے ناانصافی کی ہے۔ اسلام اُسے اپنے ہم صنفوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی

اجازت دیتا ہے ۔اُسے کامیاب معلمہ، مستند لیڈی ڈاکٹر اور اعلیٰ پایہ کی مبلّغہ بننے کی بھی اجازت دیتا ہے ۔وہ کتابت بھی کرسکتی ہے اور خطابت بھی۔ بہترین قاریہ بھی بن سکتی ہے اور اعلیٰ پایہ کی مصوّرہ بھی............ کون اُسے روکتا ہے، مگر دائرۂ کار، مگر خاص ماحول میں ۔وہ شمعِ محفل نہیں بلکہ چراغِ خانہ ہے ۔افسوس!

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت

اسلام نے بیٹیوں کی تربیت کرنے والے کو جنت کی نوید سُنائی ہے، ماں کے قدموں تلے جنت رکھی ہے ۔وہ عورت کی تعلیم سے کیسے انکار کرسکتا ہے ۔وہ عورت کو خلوت میں باوقار بناتا ہے، جلوت سے روکتا ہے ۔

صحابیِ رسولؐ نے پوچھا: ''مجھ پر سب سے پہلا حق کس کا ہے؟'' جواب ملا: ''آپ کی ماں کا .... آپ کی ماں کا .... آپ کی ماں کا۔'' محبت کے سوتے تو کئی جگہ سے پھوٹ سکتے ہیں لیکن ''مامتا'' کا سوتا تو ماں کے ساتھ ہی مخصوص ہے ۔پاک پیغمبرِ آخرالزماںؐ کا فرمان درست: ''تیری ماں، تیری ماں، پھر تیری ماں۔'' ایک شُبہ البتہ رفع کرتا چلوں ۔عرب کا معاشرہ چونکہ مردوں کا غالب معاشرہ تھا، عورت بے حیثیت تھی ۔لہٰذا محسنِ انسانیتؐ نے طبقۂ نسواں کو مردوں کے برابر لانے کے لیے بار بار اُن کے حقوق اور عظمت پر زور دیا۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ اِس سے مرد بے توقیر ہوگیا ہے ۔حقوق برابر ہیں مگر نوعیت جدا جدا ہے ۔

تمام اہلِ بصیرت متفق ہیں کہ بچے کی شخصیت ایک مقدس امانت ہے ۔اِس امانت کی ہمدردانہ حفاظت و تربیت کا انحصار دو ہستیوں (والدین اور اساتذہ) پر ہے ۔ان دونوں کے قلب ونظر کی قندیل کی روشنی میں منزل ناآشنا ہستی آغازِ سفر کرسکتی ہے ۔

☆☆☆☆☆☆

احترامِ والدین

نسل انسانی کی بقا کا ذریعہ والدین ہیں۔ اُن کی محبت بےلوث، بےغرض اور بے ریا ہوتی ہے۔ باپ کفالت کا بوجھ اُٹھاتا ہے تو ماں پرورش کرتی ہے۔ ''باپ راضی تو خدا راضی۔'' جنت ماں کے قدموں تلے رکھ دی گئی ہے۔ والدین کی خدمت صرف دنیا کی خوشحالی کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ توشۂ آخرت بھی ہے۔ نصِ قطعی ہے کہ اُنھیں ''اُف تک'' نہ کہو۔ پھر ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''میرا شکر ادا کرو اور والدین کا۔'' جو والدین کا احترام نہیں کرتا شاعر کی زبانی فرمانِ رسالت مآبؐ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

اِک دن نبیؐ نے حلقۂ احباب میں یہ لفظ — دہرائے تین بار کہ ''ناک'' اُس کی کٹ گئی
اصحابؓ نے کہا کہ یہ کمبخت کون ہے — توقیر جس کی حضرتِ باری میں گھٹ گئی
اِرشاد یوں ہوا کہ وہ فرزندِ ناخلف — گھر جس کے جنت آئی اور پلٹ گئی
ماں باپ کا جسے نہ بُڑھاپے میں ہو خیال — اُس ناسعید بیٹے کی قسمت اُلٹ گئی

اگر انسان غور کرے تو اُسے معلوم ہوگا کہ والدین ہی وہ ہستی ہیں جن کے سب سے زیادہ احسان انسان پر ہوتے ہیں۔ شیر خوارگی کے عالم میں بچہ ناتواں، بے یار و مددگار اور دوسرے سہارے کا محتاج ہوتا ہے۔ اُس وقت والدین کی محبت و شفقت، رحمت و رافت، اُن کا ایثار قابل دید ہوتا ہے۔ والدین بچے کے لیے طرح طرح کے مصائب برداشت کرتے ہیں۔ وہ خود تکلیف اُٹھا کر اُس کے لیے سامان راحت بہم پہنچاتے ہیں، اُس کی ہر ضرورت پوری کرتے ہیں، اپنی راتوں کی نیندیں حرام کر کے اُسے خوابِ راحت کا تحفہ دیتے ہیں۔ خود بھوکے رہ کر بھی اُس کے کھانے پینے کا بندوبست کرتے ہیں۔ والدین کی زندگی کا لمحہ لمحہ بچوں کی زندگی کے لمحوں سے بندھا ہوتا ہے۔ وہ بیمار ہوتے ہیں تو یہ بے چین، دن کا کام نہ رات کا آرام۔ ہر صورت اُن کی

خوشی مقصود، ہر لمحہ اُن کی تندرستی مطلوب، اُن کا روٹھنا، اُن کا منانا، اُن کا رونا، اُن کا ہنسنا، اُن کے غصے میں اُن کا دل بہلانا، اُن کی خطاؤں کو بھی اُن کی ادائیں جاننا، یہ والدین کے سوا کون کر سکتا ہے؟ ابھی بچپن کا زمانہ ختم ہوا تو تعلیم کا سفر شروع۔ طرح طرح کے تعلیم پر اُٹھنے والے اخراجات کی ذمہ داری والدین برداشت کرتے ہیں۔ اُنھیں زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے ہر مرحلہ پر اُن کی آسائش و آرام کا خیال رکھنا، راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اُس کی کامیابی کے لیے دامن پھیلانا۔

شہر میں جا کر پڑھنے والے بھول گئے　　　کِس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا

(اسلم کولسری)

''بلکہ کتنا سوت کاتا تھا۔'' پھر اُس کی شادی کے ہنگامے، اُس کی نوکری کے سلسلے اور اُس کے مستقبل کی تابناکی کے لیے ہر وقت ہمہ تن دعا گو رہنا۔ گھر سے رخصت کرتے وقت عافیت کے لیے دعا، تاخیر سے آنے کے سبب بے قرار، آنے کا انتظار، رات کو اُٹھ اُٹھ کر اُنھیں دیکھنا، دعائے خیر کرنا۔ بقول اقبال:

خاکِ مرقد پہ تری لے کر میں فریاد آؤں گا　　　اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

اللہ پاک کی نعمتیں بے حد و حساب ہیں۔ سورۃ الرحمن میں ۳۱ بار اِرشاد ہوا:

فَبِأَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ترجمہ: ''اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جُھٹلاؤ گے؟''

میرے نزدیک تو والدین سب سے بڑی نعمت ہیں جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ لہٰذا اُن کی محنت، محبت اور شفقت کا صِلہ یہی ہے کہ اُن کا کہا مانے اور اُن کی عزت کرے اور خدمت بجالائے اور بڑھاپے میں اُن کا سہارا بن جائے۔ بچے کو نُورِ نظر کہا جاتا ہے اور پھر بچوں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ والدین کی نگاہوں کا نور اور اُن کے دل کا سرور بن جائیں۔

شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی اپنی مایہ ناز تصنیف ''حُجّۃ اللہُ البالغہ'' میں لکھتے ہیں ''اخلاقی تندرستی کا مقتضاء یہی ہے کہ احسان کے بدلے احسان کیا جائے۔ اور اولاد کی تربیت میں وہ ایسے ایسے شدائد جھیلتے ہیں جو محتاجِ بیان نہیں ہیں۔ اِس لیے والدین کی خدمت گزاری بھی لازمی طریقہ

قرار دیا گیا ہے۔" (حُجّۃُ اللہ البالغہ۔ص نمبر ۸۲) دنیا کے کسی بھی مذہب کی تعلیمات اُٹھا کر دیکھ لیں ہر مذہب والدین کی تعظیم اور عزت کا درس دیتا ہے۔کنفیوشس مذہب کا بانی (۵۵۱ ق۔م) جسے ہم وطن رہبرِ اعظم یا حکیم الحکماء کہتے ہیں اُس نے ۲۵۰۰ سال قبل معاشرے کی اِصلاح کے کام کا آغاز کیا تھا۔وہ پانچ رابطوں کی بات کرتا ہے۔جس میں پہلا رابطہ" باپ کے اندر محبت وشفقت اور بیٹے میں فرزندانہ احترام وتکریم شامل ہیں۔"

تاریخ میں حضرت اسمٰعیلؑ کی مثال، اُن کی اطاعت شعاری کا منظر چشمِ فلک نے ما قبل نہیں دیکھا تھا۔باپ کے اِشارے پر قربانی کے جذبے سے سرشار مِنیٰ کے میدان میں حلق پر چُھری چلنے کے منتظر ہیں۔لیکن خالق حق اور محافظِ مطلق کی رحمت کا دریا اور طرح سے بہہ نکلا۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی سِکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

اِسی لیے تو اِسلام نے ہر بالغ اور عاقل مسلمان مرد اور عورت کو نماز میں سلام پھیرنے سے پہلے یہ دعائیں پڑھنے کا حکم دیا ہے: اولاد کی فلاح اور والدین کی مغفرت کی دعائیں۔پھر "سورہ نوح" میں اِرشاد ہوا: ترجمہ" میرے رب بخش دے مجھے اور میرے والدین کو اور اُسے بھی جو میرے گھر میں داخل ہوا۔اور مومن مردوں اور عورتوں کو بھی بخش دے۔" پس ثابت ہوا کہ زندگی میں ہی نہیں بلکہ اُن کی وفات کے بعد بھی کم از کم پانچ مرتبہ اُن کے لیے دعائے مغفرت کرنا اولاد کے لیے ضروری ہے۔اولادِ صالحہ کا ہر نیک عمل والدین کے لیے اجر کا باعث ہے۔اقبال کی دُعا ملاحظہ ہو:

مِثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نَورستہ اِس گھر کی نگہبانی کرے

☆☆☆☆☆☆

شجرکاری کی ضرورت اور اہمیت

شجرکاری صدقۂ جاریہ ہے۔انسان کا اِس سے ازل کا تعلق ہے۔اشجار اور چراگاہیں ہر عہد میں انسان کی ضرورت رہی ہیں۔ایامِ جاہلیت میں عربوں کی لڑائیاں اِنھیں نخلستانوں اور چراگاہوں پر ہوتی رہی ہیں۔درخت کی ضرورت اور اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔اُردو ادب میں جا بجا اِن اشجار کا ذکر ملتا ہے۔بقول آتش:

سفر ہے شرط،مسافر نواز بُہتیرے ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

بقول اقبال:

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا بلبل تھا کوئی اُداس بیٹھا

مجید امجد:

جُھک پڑا ہے آ کے رستے پر کوئی نخل بلند
تھام کر جس کو گزر جاتے ہیں آسانی کے ساتھ
موڑ پر سے ڈگمگاتے رہرووں کے قافلے
ایک بوسیدہ ، خمیدہ پیڑ کا کمزور ہاتھ
سینکڑوں گرتے ہوؤں کی دست گیری کا امیں

پھر ناصر کاظمی کے بقول:

میٹھے تھے جن کے پھل وہ شجر کٹ کٹا گئے
ٹھنڈی تھی جس کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی

قرآنِ پاک میں بار باران پھلوں اور درختوں کا ذکر ملتا ہے۔کہیں انگور کی بیلوں کا ذکر،کبھی کھجور کے خوشوں کی بات،کبھی سبزیوں اور انار کا تذکرہ۔یہ انسان کی ضرورت بھی ہیں اور زمین کا حُسن بھی۔جنت کے خوب صورت نظاروں میں بھی ان کے تذکرے کسی اہلِ بصیرت سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

گویا درختوں کی افادیت اور اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ دنیائے ادب میں تو یہ راحت اور افادیت کا استعارہ ہیں۔ جب اسلامی فتوحات کا زمانہ تھا، پیغمبرِ اسلام اور خلفائے اسلام کے لشکروں کو روانگی سے پہلے سپہ سالار کو یہ حکم دیا جاتا تھا: بچوں اور عورتوں کو قتل نہیں کرنا، بوڑھوں کا احترام بھی کرنا ہے اور پھل دار درختوں کو مت کاٹنا۔

درخت انسانیت کے لیے فطرت کا بہترین تحفہ ہیں۔ یہ ازلی ساتھی ابتدا سے ہی انسان کے کارساز رہے ہیں۔ کبھی انھیں سایہ فراہم کیا اور کبھی ان کے تن ڈھانپنے کو اپنے پتے مہیا کیے۔ پھر انھیں غذا کے لیے نوع بہ نوع پھل پیش کیے۔ یہاں تک کہ سانس لینے کے لیے فطری آکسیجن فراہم کی۔ درختوں کے بہت بعد سائنس دان اِس حقیقت سے آشنا ہوئے کہ:

آکسیجن سے شبستانِ عناصر تاب ناک
مضطرب ہر ذی نَفس اس کی رفاقت کے لیے

باغوں میں جھومتے درخت، لہلہاتے ہوئے پودے، چٹکتے غُنچے، مسکراتی کلیاں، مہکتے پھول، سرسبز و شادات گھاس کا زمردیں فرش آنکھوں کو طراوت، دماغوں کو راحت اور دِلوں کو طمانیت اور سرور عطا کرتے ہیں۔ ان کی افادیت سے کوئی صاحبِ دل انکار نہیں کرسکتا۔ مگر انسان بھی عجیب مخلوق ہے کہ شگوفوں کو نوچنے، پھولوں کو توڑنے اور درختوں کو کاٹنے سے گریز نہیں کررہا۔ کسی نے کیا خوب کہا تھا کہ ”بعض حریص طبیعتیں پھولوں کو سرِ شاخ دیکھ کر گل چینی کرکے اُن کی رگِ حیات کاٹ دیتی ہیں۔ اُنھیں کیا معلوم کہ وہ کتنی زیادہ بدذوقی اور سنگدلی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔

درختوں کے خنک سایوں کی قدر و قیمت تو کوئی آبلہ پا مسافر ہی جان سکتا ہے۔ پھولوں کے پودوں کی قدر و قیمت کوئی لطیف مزاج شاعر ہی جان سکتا ہے۔ درخت یہی بتاتے ہیں کہ ”تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو دوسروں کے لیے زندہ رہو۔“ یہ فرمان حضرت علیؑ کا ہے جو اُنھوں نے مسلمانوں کو عطا کیا تھا۔ آج کا مسلمان یہ سب کچھ فراموش کر چکا ہے۔

کہتے ہیں نوشیرواں کی سواری جارہی تھی۔ راستے میں اُس نے دیکھا کہ تقریباً 80 سالہ بوڑھا ایک آم کا درخت لگا رہا ہے۔ اُسے پاس بلایا اور پوچھا: ”بزرگوار! آپ عمر رسیدہ ہیں۔ جب یہ درخت

پھل دے گا تو شاید آپ ہوں یا نہ ہوں۔" اُس نے بے ساختہ کہا: "عالی جاہ! اوروں نے لگائے ہم نے ان کا پھل کھایا۔ اب ہم لگائیں گے تاکہ دوسرے کھائیں۔" بادشاہ نے اُس کے خدمت کے جذبے کو سراہا اور خوش ہو کر انعام سے نوازا۔ یہ وہی کر سکتا ہے جو جانتا ہے:

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے آتے ہیں جو کام دوسروں کے

درخت اِسی امر کی علامت ہیں۔ یہ درخت ہیں جو مسافروں کو سایہ، پھل، عمارات کے لیے لکڑی اور خود جل کر لوگوں کو خوراک فراہم کرتے ہیں۔ مولانا روم مثنوی میں لکھتے ہیں: یہ بانسری فریاد کر رہی ہے۔

خشک مغز، خشک تار و خشک پوست از کجا می آید ایں آوازِ دوست

آج کی دنیا میں سائنس کی ترقی کے نام پر فضا کو دھواں دھواں کر دیا گیا ہے۔ چمنیوں سے خارج ہونے والی گیسوں نے ماحول کو آلودہ کر دیا ہے۔ طرح طرح کی سانس کی بیماریاں بڑھ گئی ہیں۔ فضا میں سانس لینا عذاب بن چُکا ہے۔

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کُچل دیتے ہیں آلات

آج اربوں، کھربوں درخت لگانے اور اُنھیں پروان چڑھانے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ پاکستان میں بڑی تیزی سے اِس کارِخیر کا آغاز ہو چکا ہے۔ حکومتِ وقت بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ مسئلہ صرف درخت لگانے اور پروان چڑھانے کا نہیں ہے بلکہ تندرست اور توانا درختوں کی حفاظت کا بھی ہے۔ ہم نے جنگلوں کے جنگل کاٹ ڈالے ہیں۔ جہاں نئی آبادیاں بن رہی ہیں وہاں درخت کٹ رہے ہیں۔ ان نئی آبادیوں میں کوئی بڑا درخت نظر نہیں آتا۔ درخت آلودہ، کثیف اور گُھٹی گُھٹی فضا کو ایک صحت مند نکھار عطا کرتے ہیں۔ یہ امر بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ درخت زمین کی زرخیزی کو قائم رکھنے، آبی کٹاؤ کو روکنے، سیلاب کے ریلوں میں کمی کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ درخت آج بھی اتنے ہی نفع بخش ہیں جتنے کہ پہلے زمانے میں تھے۔ عمارتی لکڑی سے لے کر ایندھن کی دستیابی تک کاغذ، ماچس، چپ بورڈ، بروزہ، کیمیاوی اشیاء سے لے کر

حیوانات کے چارے تک، انسانوں کی غذائی ضروریات کو پورا کرنے میں ہر طرح سے درخت انسان کے ہمدرد اور غم گسار ہیں۔

درخت زراعت میں زمیندار کی اعانت کرتے ہیں۔ترقی یافتہ مما لک میں شجر کاری کے بغیر زراعت نامکمل ہے۔فالتو وقت میں شجر کاری کرنے سے آمدنی میں اضافہ ممکن ہے۔ریشم کے کیڑے پالنے کو ایک اضافی شغل کے طور پر اپنایا جا سکتا ہے۔سیم وتھور کو ختم کرنے کے لیے مفید اور فطری ٹیوب ویل ہیں۔خود کو ٹڈی دل کے سامنے پیش کر کے فصلوں کی حفاظت کا کام کرتے ہیں۔ جنگلات سے صرف لکڑی ہی حاصل نہیں ہوتی بلکہ شہد جیسی نعمت اور دواؤں کے لیے جڑی بوٹیاں بھی میسّر آتی ہیں۔معاملہ گھر کی آسائش کا ہو یا گھوارے کی آرائش کا، بات چار پائی کی ہو یا میّت کے تختے کی، سلسلہ آب وہوا کے اعتدال کا ہو یا تھل کے ریگستان کا، ہر جگہ اشجار کی بہار اور شجر کاری کی حکمرانی نظر آتی ہے۔

ہمارے ہاں آبادی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔اس کے مقابلے میں جنگلات کم ہو رہے ہیں۔ہمارے ملک میں جنگلات کا تناسب صرف تین فیصد ہے۔ یہ تناسب قابلِ تشویش ہے۔آج کا دور صنعتی دور بنتا جا رہا ہے۔اس کے لیے بھی درخت بہت ضروری ہیں۔ریشم کے کیڑوں کے لیے شہتوت، لاکھ کے کیڑوں کے لیے بیری، سیڑھیاں بنانے کے لیے بانس، ٹوکریاں بنانے کے لیے تُوت اور چمڑا رنگنے کے لیے کیکر کی چھال ضروری ہے۔الغرض شجر کاری کے معاملے میں ہماری دلچسپی برائے نام رہی ہے۔لہٰذا آبادیوں کا حُسن، کوہسار کے دلفریب نظارے، تفریح کا سامان اور سیاحوں کی کشش برائے نام رہ گئی ہے۔ چرندوں اور پرندوں کی پناہ گاہیں کم سے کم ہوتی جا رہی ہیں۔جنگلی حیات رکھنے والی قیمتی نسلیں نایاب ہو گئی ہیں۔سبزہ زار، بنجر، خیابان ویران اور دیہات افسردہ نظر آ رہے ہیں۔ہم نے فطرت کے دل آویز نظاروں کی اداؤں کو تار تار کر دیا ہے۔اس طرف بھرپور توجہ کی ضرورت ہے۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر حکومت اور افراد مل کر اِس کارِخیر میں حصہ لیں ورنہ فطرت کی تعزیریں بہت سخت ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

ماحولیاتی آلودگی

''طہارت جزوِایمان ہے۔'' آلودگی طہارت کی ضد ہے۔اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔زندگی کے ہر شعبے پر حاوی، عمل کے ہر پہلو کے لیے چراغِ ہدایت، فکر کے ہر گوشے کے لیے نور اور شعور کا ہر زاویہ اس شمعِ ہدایت سے منوّر رہے۔اسلام جمالِ پیہم ہے۔اس کے نور کی شعاعیں اطراف واکناف میں پھیلی ہوئی ہیں۔اسلام مومن کے باطن اور اس کے ظاہر، اس کے ماحول کو حسین بنانا چاہتا ہے۔جو بنے خوب بنے۔ہر تعمیر تحسین کا پہلو رکھتی ہو۔اسلام ایسی سادگی کا تقاضا کرتا ہے جو سراپا حسن ہو۔آلودہ ماحول میں پرورش پانے والے افراد کے ذہن شفاف نہیں ہو سکتے۔بدوی زندگی حضروی زندگی کے مقابلے میں زیادہ سادہ اور زیادہ فطری ہوتی ہے۔کہاں ہیں شہر کے مکیں ...... وہ بے نصیب اُٹھے نہیں۔کسان اُٹھ کھڑے ہوئے، مویشیوں کو لے چلے۔ عرب کے شرفاء اپنے بچوں کو لڑکپن تک صحرائی ماحول میں اِس لیے رکھتے تھے کہ وہاں اُن کی صحت بھی مثالی ہو اور سیرت بھی پاکیزہ۔اس ماحول میں زبان کے جوہر بھی کھلتے ہیں اور زبانِ غیر کا سایہ بھی نہیں پڑتا۔کھلی فضا فکر و نظر کو کشادگی عطا کرتی ہے۔درخت، جنگل اور سبزہ ماحول کو شگفتگی اور تازگی بخشتا ہے۔اسلام فوجوں کو حکم دیتا ہے کہ ہری بھری فصلوں، کھیتوں، درختوں اور سبزہ زاروں کو تباہ و برباد نہ کریں۔قرآنِ پاک بار بار ماحول پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

گلزارِ ہست و بود نہ بے گانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اِسے بار بار دیکھ

ایک بار دیکھا تو دوسری بار دیکھنے کی ہوس نہیں بلکہ بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ہوش مندی کا تقاضا ہے کہ منظر کو صرف ایک بار نظر بھر کر دیکھ لو۔اِتنی دیر نہ لگاؤ کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے۔پرندوں کا کیا اعتبار کب اُڑ جائیں۔دھوپ کا کیا بھروسا، کب ڈھل جائے۔معتبر وقت ہے یا فطرت۔فطرت کا حُسن کیا دیدنی تھا۔محفلِ قدرت ایک بے پایاں حُسن ہے۔کُہسار کے نظارے دامنِ

دل کو کھینچتے ہیں۔ پانی اِتنا شفاف کہ کدورت دھل جائے۔ اور ہوا اِتنی پاک کہ ہوا و ہوس دم نہ مار سکے۔ نہ دنیا کی محفلوں کا شور، نہ دنیاداروں کی سیاست کا زور۔ ایسے مناظر تو سیاح کے قدم کو میسر ہیں یا شاعر کے تخیّل کو۔ انسان کے ذمے تھا کہ وہ اس ماحول کو خوب سے خوب تر بنا کر آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑے۔ اُس بوڑھے کی طرح جو نوشیراں سے کہہ رہا تھا: ''اوروں نے لگائے، ہم نے کھائے۔ ہم لگائیں گے اور دوسرے کھائیں گے۔'' ماحول کا بہتر بنانا، قدرتی نعمتوں کی قدر کرنا اور اس کی حفاظت کرنا ہماری اوّلین ذمہ داری بھی ہے اور شکریہ کا عملی اظہار بھی (شکرِ نعمت)۔

ماحولیاتی آلودگی انسانی زندگی کے لیے زہرِ قاتل ہے۔ جگہ جگہ گرد و غبار کے مراکز، کراچی جیسے شہر میں کچرے کے ڈھیر، لاہور کو آلودگی کے اعتبار سے دنیا کا تیسرا بڑا شہر قرار دیا جا رہا ہے۔ پطرس بخاری نے بہت پہلے لکھ دیا تھا کہ بلدیہ لاہور نے جگہ جگہ گرد و غبار اور دھویں کے مراکز کھول دیے ہیں تا کہ سانس لینے میں دُشواری نہ آئے۔ کتنا گہرا طنز اور امرِ واقع کا مزاح تھا۔

دریائے راوی جس کے کنارے لاہور شہر آباد تھا، اب بہنے کا شغل چھوڑ چکا ہے۔ سیلابی ریلے اور آلودہ پانی کے کام آتا ہے۔ مچھلیاں پہلے ہی دم توڑ چکی ہیں۔ لیکن دریا میں مچھلیوں کو خوراک ڈالنے کی رسم فی الوقت جاری ہے۔ اب وہاں بگلے اور مچھلیاں تو مشکل سے ملتے ہیں البتہ چیلیں اُڑتی دِکھائی دیتی ہیں۔ اِس طرح دریائے راوی چیلوں کا کوچہ دکھائی دیتا ہے۔ ماحول کی آلودگی میں ہماری خواہشات کا بھی بڑا دخل ہے۔ ہماری بہت سی خواہشات میں ہماری ہلاکت کا سامان ہوتا ہے۔ اِس لیے قدرت انھیں پورا نہیں کرتی اور ہم سمجھتے ہیں کہ دعا قبول نہیں ہوتی۔ ماحولیاتی آلودگی کی کئی اقسام ہیں۔ فضائی آلودگی، آبی آلودگی، شور شرابہ کی آلودگی اور فکری آلودگی۔ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ جیسے لوگ ہوں گے ویسے ہی حکومت قائم ہوگی۔ صنعتی انقلاب کے بعد تو یہ طوفانِ بدتمیزی بڑھتا ہی چلا گیا ہے۔ لیکن ترقی یافتہ ممالک میں ماحول کی آلودگی کو ختم کرنے اور اس سے بچاؤ کی تدابیر کرنے کو بہت سی تنظیمیں موجود ہیں اور سرگرمِ عمل بھی مگر ہمارے ہاں ماحول کو بچانے، سنوارنے اور نکھارنے والے لوگ بہت کم ہیں۔ ہمارا

معاشرتی ویژن برائے نام ہے۔ ہمارے گلی کوچوں کی کوئی نکڑ غلاظت سے پاک نہیں۔ ہم بڑی بڑی مہنگی اور آراستہ اور پیراستہ رہائش گاہیں تعمیر کرتے ہیں مگر پانی کے نکاس کا معقول انتظام نہیں کرتے۔ امیر لوگوں کی گاڑیاں سڑک کے کناروں پر دھوئی جاتی ہیں اور پانی سڑک پر۔ پوش علاقہ جات میں بھی یہی مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہم نے اپنے کوڑے کا شاپر ہمسائے کی دیوار کے ساتھ یا اُس کے گھر کے سامنے پھینکنا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کوئی خالی پلاٹ ایسا نہیں جس میں اہلِ محلّہ نے ڈھیروں کوڑا نہ پھینکا ہو۔ ''جب کعبہ سے کفر پھوٹے گا تو مسلمانی کہاں رہ جائے گی۔'' ہمارے رویّے ہماری تباہی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ بقول حبیب جالب:

محبت گولیوں سے بو رہے ہو وطن کا منہ لہو سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

چاہتے ہو تم اگر نکھرا ہوا فردا کا رنگ
سارے عالم پر چھڑک دو گُنبدِ خضریٰ کا رنگ

حفیظ تائبؒ

ہمارا سیاسی اور سماجی شعور بہت پست ہے۔ دوسرے ممالک میں اگر کوئی حکومت جنگلات کاٹ کر درختوں کو ختم کرتی ہے تو لوگ سراپا احتجاج ہو جاتے ہیں۔ مگر ہم اپنی زرعی زمینوں، اپنے سبزہ زاروں اور شاداب جنگلوں کو کاٹ کر کالونیاں بنائے جا رہے ہیں۔ حفاظتی تدابیر کے بغیر کارخانے تعمیر کر رہے ہیں۔ ہماری آبادیوں کے درمیان خشت کے بھٹہ جات ہر سو فضا کو آلودہ کرتے ہیں۔ یہ زہریلی ہوا انسانی جانوں اور حیوانات کے لیے بھی بہت مضر ہے۔ اگر ہم نے بروقت تدبیر نہ کی تو ہماری حالت صومالیہ اور ایتھوپیا جیسی ہو جائے گی (اللہ نہ کرے)۔ ہم سرکاری سطح پر شجر کاری کے ہفتے مناتے ہیں مگر ہماری شجر کاری کی مہمات جمہوریت کے شجر کی طرح کبھی پروان نہیں چڑھتی۔ کیونکہ اس میں نمائش زیادہ اور خلوص کم ہوتا ہے۔ ہمیں درختوں کو ایسے پالنا ہے جیسے بچوں کو پالتے ہیں۔ پودے بڑھ کر جو رنگ و نور حاصل کریں گے وہ بنی نوعِ انسان میں

بانٹ دیں گے۔کبھی خوراک کی صورت میں،کبھی لباس کی صورت میں اور کبھی مویشیوں کی خوراک کی صورت۔جیسے فرمانِ الٰہی ہے:''یہ تمھارے اور تمھارے مویشیوں کے لیے متاع ہیں۔''

ہم پاکستانی ملی،سیاسی اور دینی اعتبار سے پس ماندہ ہیں۔ہم اِس احساس سے بھی بے گانہ ہیں کہ صاف ماحول اچھی صحت کی دلیل ہے اور اچھی صحت ذہن وفکر کی شگفتگی کا باعث ہے۔گندہ ماحول گندی سوچ پیدا کرتا ہے۔مریضانہ ذہنیت جنم لیتی ہے۔غلامی کے زمانے میں ایک ڈپٹی کمشنر نے اپنے نئی آنے والے اسٹنٹ کمشنر (A.C) سے کہا تھا: پنجاب کے یہ لوگ بڑے عجیب ہیں۔یہاں انسان اور اُن کے حیوان ایک ساتھ رہتے ہیں۔مکان کے ساتھ ہی اکثر مویشیوں کی حویلی بھی ہوتی ہے۔جس نوع کا ماحول ہوگا،انسانی فکر کی لہریں اور دلی ولولے بھی ویسے ہی ہوں گے۔تنگ وتاریک ماحول میں کشادگی اور فکری ترفع ممکن نہیں ہوتا۔

دِلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اُٹھتے
نگاہوں میں نہ ہوں پیدا اگر اندازِ آفاقی

ماحولیاتی آلودگی ایک عالمگیر مسئلہ بن چکا ہے۔پوری دنیا شور،غلاظت،دھویں اور کیمیائی فضلہ جات کی زد میں ہے۔ترقی ہورہی ہے مگر دم گھٹا جارہا ہے۔اِس لیے بہتری کی چند تجاویز یہ ہوسکتی ہیں:

۱۔ تعلیم کے ذریعے سماجی شعور پیدا کیا جائے
۲۔ درخت لگائے بھی جائیں اور اُن کی حفاظت بھی کی جائے
۳۔ کارخانے آبادیوں سے دور لگائے جائیں۔اُن کی چمنیوں کے منہ کھلے اور انتہائی بلندی پر ہوں
۴۔ بجلی اور گیس کو بطور ایندھن استعمال کیا جائے۔
۵۔ دیہاتوں میں تعلیمی اور صحت کی زیادہ سہولیات دی جائیں تاکہ دیہاتوں سے شہروں کی طرف انتقالِ آبادی کا سلسلہ رُک جائے۔

ہمارے ملک میں جنگلات کا رقبہ صرف 3 فیصد ہے جبکہ ترقی یافتہ مما لک میں یہ تناسب 25 فیصد ہے۔ اِس میں اضافہ کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔ لوگوں میں جنگلی حیات کے تحفظ کا احساس بیدار کیا جائے۔ درخت نعمت ہیں۔ آکسیجن چھوڑتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کرتے ہیں۔ جب کہ پیپل کا درخت رات کے وقت بھی آکسیجن چھوڑتا ہے۔ بعض مذاہب میں اِس کو دیوتا مانتے ہین۔ ہمیں ہر ممکن کوشش کر کے ماحولیاتی آلودگی کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔

رہی بات فکری آلودگی، وحدت سے گریز، نفسی نفسی کی فضا، 20 ویں صدی میں مسلمانوں کو دو نعمتیں عطا ہوئیں، آزادی کی نعمت اور تیل کی دولت۔ ہم اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکے۔ کیوں کہ اُمت کا اتحاد پارہ پارہ ہے۔

شیشے دِلوں کے گردِ تعصّب سے اٹ گئے
روشن دماغ لوگ بھی فرقوں میں بٹ گئے

اس کے لیے قرآنی افکار اور تعلیمات کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں عشقِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

پھر نظارہ دیکھنا:

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

بہترین معاشرے کا نام اُمت ہے جس کا ایمان ایک اور ہدف مشترک ہے۔

☆☆☆☆☆☆

مسئلۂ کشمیر اور اُس کا حل

مسئلۂ کشمیر عالمی سطح کا مسئلہ ہے اور 1947ء سے لے کر آج تک حل طلب ہے۔ یہ مسئلہ تمام اقوامِ عالم کو اپنی طرف پکار رہا ہے۔ اِس مسئلہ کے تین فریق ہیں: اہلِ کشمیر، بھارت اور پاکستان۔ مسئلہ یہ ہے کہ بھارت نے 75 سال سے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ جمارکھا ہے۔ اہلِ کشمیر کی مسلسل جدوجہدِ آزادی اور اُن کی قربانیاں آج بھی بین الاقوامی اِداروں اور طاقت ور قوموں کی غیرت، حمیت اور انصاف کی راہ دیکھ رہی ہیں۔ معاملہ وہیں کا وہیں ہے۔ کسی شاعر نے اس بے حسی کی طرف کیا خوب اشارہ کیا ہے:

تمھاری بھینس کیسے ہے کہ جب لاٹھی ہماری ہے
اب اِس لاٹھی کی زد میں جو بھی آئے سو ہمارا ہے
مذمّت کاریوں سے تم ہمارا کیا بگاڑو گے
تمھارے ووٹ کیا ہوتے ہیں جب ویٹو ہمارا ہے

پاکستان کا کشمیر اور اہلِ کشمیر کے ساتھ گہرا قلبی تعلق ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے کہا تھا: ''کشمیر ہماری شہ رگ ہے۔'' دوسری طرف بھارت اِسے اپنا اٹوٹ انگ قرار دے رہا ہے۔ اُس کی سات لاکھ سے زیادہ فوج بہت عرصہ سے اہلِ کشمیر کے خون کے ساتھ ہولی کھیل رہی ہے۔ اُن کا ستم اور جارحانہ رَوِش اہلِ کشمیر کے حوصلوں کو پست نہیں کرسکی اور نہ کرسکتی ہے۔

اُن کی حُریتِ فکر توانا اور آزادی کی تحریک روز بروز زور پکڑتی جا رہی ہے۔ بھارت کے فوجی اور آر۔ ایس۔ ایس (R.S.S) کے غنڈے اُن کے حوصلوں کو پست نہیں کر سکتے۔ اُن کے حوصلے آج بھی بلند ہیں۔ تحریکِ آزادیِ کشمیر آج بھی زوروں پر ہے۔ کرفیو کا نفاذ، A-35 اور 370 کی دفعات نے آزادی کی روح کو بیدار اور تحریک کو توانا کر دیا ہے۔ پاکستان ہر سطح پر اُن کی

آواز کو بلند کر رہا ہے۔ پاکستان کی اخلاقی، سیاسی، سفارتی کوششیں رنگ لا رہی ہیں۔کشمیری رہنما کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

گھر سے تا درِ زنداں اور وہاں سے مقتل تک
ہر امتحاں سے ترے جاں نثار گزرے ہیں

کشمیر اپنے قدرتی حسن، دلفریب نظاروں، بہتے دریاؤں، کوہساروں سے پھوٹتے چشموں، زعفران کے لہلہاتے کھیتوں، سرسبز و شاداب چراگاہوں، دیدہ زیب آبشاروں، چنار کے بلند و بالا درختوں، مہکتے پھولوں، پھل دار درختوں اور لٹکتے پھلوں کی وجہ سے جنت نظیر اور ایرانِ صغیر کہلاتا ہے۔ یہ مسلمانوں کی غالب اکثریت کی ریاست ہے جو تقریباً 77% ہیں۔ 85806 مربع میل پھیلاؤ کا رقبہ، بلند ترین کھلے میدانوں جن کی بلندی 7672 میٹر اور پست ترین بلندی 305 میٹر ہے۔ اِس میں تین قومیں مسلمان، ہندو اور بدھ مت کے پیروکار آباد ہیں۔کشمیر کے تین حصے ہیں۔جموں، کشمیر اور لدّاخ۔جموں مندروں کا شہر ہے جس میں 66% ہندو اور 28% مسلمان آبادی ہے۔وادیِ کشمیر میں 95% مسلمان آباد ہیں۔لدّاخ میں 50% بدھ مت کے پیروکار رہتے بستے ہیں۔لدّاخ بُدھ مت ثقافت اور قدرتی حُسن کے اعتبار سے جانا جاتا ہے۔کشمیر میں بولی جانے والی آٹھ زبانیں ہیں جبکہ سرکاری دفتری زبان اُردو ہے۔کشمیر کی اصل اہمیت اس کے غیر معمولی محلّ وقوع کی وجہ سے ہے۔ یہ ریاست برِّصغیر پاک و ہند اور وسط ایشیا کے مما لک روس، چین، افغانستان اور تبت کے عین قلب میں واقع ہے۔ ہندوستان سے کشمیر کو جانے والا واحد راستہ ضلع گورداس پور کی تحصیل پٹھان کوٹ کے ''پُل'' کٹھوعہ سے ہو کر گزرتا ہے۔جبکہ کشمیر سے نو (۹) راستے پاکستان میں داخل ہوتے ہیں۔

پاکستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق فطری، جغرافیائی اور نظریاتی نکتۂ نظر بلکہ ہر اعتبار سے بنتا تھا۔کشمیر نہ صرف اسلامی لحاظ سے ایک ریاست تھا بلکہ جغرافیائی اعتبار سے بھی اسے ہمیشہ پاکستان کی سکیم کا حصہ سمجھا گیا تھا۔کشمیر کی کوہ ہمالیہ کے دامن میں تین سو میل لمبی سرحد پاکستان سے ملتی ہے۔

چودھری رحمت علی کے بنائے ہوئے پاکستان کے اوّلین نقشے میں کشمیر کو پاکستان کے حصے کے طور پر دِکھایا گیا تھا اور پاکستان کا ''ک''، کشمیر کی نمائندگی کرتا تھا۔اصل سازش کا آغاز تو 3 جون 1947ء کے منصوبے سے ہوگیا تھا۔ اِس خطے میں ہندوؤں کی ریشہ دوانیاں شروع ہوگئی تھیں۔ بدقسمتی یہ تھی کہ کشمیر کا مہاراجہ تنگ دل ہندو تھا۔ وہ ہر صورت کشمیر کو بھارت کا حصہ بنانا چاہتا تھا۔لیکن ظاہراََ کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔نہرو بھی ایک کشمیری خاندان سے تھا اُس کی بھی کشمیر سے جنونی رغبت تھی جو اُس کی تحریروں سے ظاہر ہے۔ پھر لارڈ ماؤنٹ بیٹن آخری وائسرائے ہند اور اُس کی اہلیہ کے نہرو خاندان سے تعلقات کی داستان کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ کانگریسی صدر اچاریہ کرپلائی کا دورۂ کشمیر، مشرقی پنجاب کی دو متعصب ریاستوں پٹیالہ اور کپورتھلہ کے راجاؤں کی مہاراجہ کشمیر سے ملاقاتیں۔ بالآخر گاندھی نے دورۂ کشمیر کر کے متذبذب راجہ کو بھارت کے ساتھ الحاق کے حق میں فیصلہ کرنے پر آمادہ کرلیا۔

راجہ کے عزائم کی حقیقت تب کھلنا شروع ہوئی جب اُس نے پنجاب کی سرحد کے قریب ترین پونچھ اور جموں کے علاقوں میں اپنی فوج بھیجی۔ وہ ساری فوج ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھی۔بعد میں یہاں کے مسلمانوں کو ہتھیار جمع کروانے کا حکم دیا گیا تو شکوک وشبہات مزید گہرے ہو گئے۔

جب پاکستان بنا تو ایک طے شدہ فارمولے کے تحت مسلمان اکثریت کے علاقے پاکستان کا حصہ بننے تھے۔اس کے تحت مغرب میں مغربی پاکستان اور مشرق میں مشرقی پاکستان معرضِ وجود میں آئے۔آخری وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی خواہش تھی کہ اُسے بھارت کے ساتھ پاکستان کا پہلا گورنر جنرل بنا دیا جائے۔مگر قائدِ اعظمؒ نے اُس کی بات قبول نہ کی۔نہرو خاندان سے تعلقات، ذاتی خواہش کی پسپائی نے سازش کا جال بُنا اور اُس کے باؤنڈری کمیشن کے چیئرمین ریڈکلف کو مجبور کیا گیا کہ گورداسپور کے ضلع کی تین تحصیلیں بھارت کو دے دی جائیں۔اس طرح بھارت کو کشمیر میں داخلے کا راستہ مہیا کر دیا گیا۔اِس غیر منصفانہ تقسیم کے باعث کشمیر کے مسئلے کی پہلی

اینٹ رکھ دی گئی۔اور دونوں نومولود حکومتیں ایک دوسرے کے سامنے سینہ سپر ہوئیں۔آزادی کی نعمت بے کیف ہو کر رہ گئی۔اب تک کشمیر کے مسئلے پر پاکستان اور بھارت کے درمیان تین جنگیں (1948ء،1965ء اور 1971ء) ہو چکی ہیں۔دونوں ممالک ایٹمی قوتیں بھی ہیں۔کشمیر کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال، ہندو قیادت کی ہٹ دھرمی اور کشمیر کو ہڑپ کرنے کی کوشش،مودی کی عاقبت نااندیش روِش اور سفاکانہ چالیں کسی بڑی تباہی کا پیش خیمہ ہیں۔جس سے عالمی امن اور دنیا کی زندگی تباہ و برباد ہو سکتی ہے۔اب تو مظلوم کشمیری جان کی بازی لگانے پر اُتر آئے ہیں۔وہ کہہ رہے ہیں کہ زمین پر کھینچی ہوئی لکیریں تلوار کی نوک سے سیدھی کی جاتی ہیں۔مگر حکومتِ پاکستان اُن کو ایل۔او۔سی عبور نہ کرنے کا مشورہ دے رہی ہے۔جب بھارت نے ایک سازش کے تحت 19 اکتوبر 1947ء ریاستِ جموں و کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرنے کی کوشش کی اور اُنھوں نے طے شدہ مسلّمہ اصولوں سے روگردانی کی تو کشمیری مسلمان اُن کے خلاف سینہ سپر ہوئے اور غیور قبائلی پٹھان بھائیوں نے کشمیری مسلمان بھائیوں کی مدد کی۔کشمیری مسلمانوں کے پاؤں میں جب کانٹا چبھا تو پاکستان کا ہر پیر و جوان بھی اس کے خلاف سینہ سپر تھا اور اُن کی آزادی کے لیے دعا گو ہو گیا۔قائدِاعظمؒ بھی پاکستانی فوج بھیجنا چاہتے تھے مگر جنرل گریسی نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور چند تیکنیکی وجوہات بیان کیں۔آخر کار نہتّے کشمیری اور قبائلی پٹھان مسلمان ایمانی جذبوں کے باعث مسلمانوں کی پناہ گاہ آزاد کشمیر کا 4144 مربع میل کا علاقہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ابھی اُن کی پیش قدمی جاری تھی کہ نہرو بھاگا بھاگا یو۔این۔او گیا اور جنگ بندی کی درخواست کی۔ پاکستانی حکومت نے بین الاقوامی حکم کی تعمیل کر کے اصول پسندی کا ثبوت دیا۔ بعض کی رائے تو مختلف ہے کہ اگر جنگ بندی نہ کی جاتی تو مسئلۂ کشمیر تب کا حل ہو چکا ہوتا۔اور آج کشمیر آزاد ہوتا یا پاکستان کا حصہ بن چکا ہوتا۔مگر تقدیر کو کون روک سکتا ہے۔

آخر کار سلامتی کونسل نے 12 اگست 1948ء اور 5 مئی 1949ء کو دو قرار دادیں منظور کیں جن میں کشمیر میں جنگ بندی اور اقوامِ متحدہ کی زیرِ نگرانی ریفرنڈم کا فیصلہ کیا تا کہ کشمیری

عوام اپنی اُمنگوں کے تحت اپنے الحاق کا فیصلہ کرسکیں۔بھارت نے پہلے تو اسے تسلیم کرلیا اور بعد میں مکر گیا۔تنگ آ کر 1989ء میں کشمیریوں نے اپنی مسلّح جدوجہدِ آزادی کا آغاز کیا۔اور اُن کا نعرہ ہے، کشمیر بزورِ شمشیر۔مگر بھارت اِس کا الزام پاکستان کے سر تھوپ کر اپنی سفّاکی اور عیاری پر قائم ہے۔تقسیمِ ہند کے وقت ہندوستان کی تین ریاستیں جونا گڑھ، حیدرآباد اور کشمیر میں تنازعات پیدا ہوئے۔جونا گڑھ کا نواب الحاقِ پاکستاں کا آرزومند تھا۔بھارت نے اُس پر بزورِ شمشیر قبضہ کر لیا۔حیدرآباد دکن کا نظام مسلمان تھا۔ریاست کی آبادی ڈیڑھ کروڑ تھی اور یہ آزاد رہنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی۔عین قائدِاعظمؒ کی وفات کے دن 11 ستمبر 1948ء کو بھارت اس پر قابض ہوا۔ایسے کشمیری مسلمان بھی پاکستان کا حصہ بننے پر آمادہ تھے مگر بھارت کی ہٹ دھرمی سے اُن کی تہذیب اور سرزمین لہو رنگ ہے۔

سنا ہے بہت سستا ہے خون وہاں کا　　اِک بستی ہے جسے لوگ کشمیر کہتے ہیں

اِس سے بڑھ کر بھارت کی جوع الارض اور توسیع پسندانہ عزائم کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟

میرا نصب العین

بے مقصد زندگی تو درندگی ہے۔ مقصدِ حیات انسان کا شرف ہے۔ تمام جمادات، نباتات اور حیوانات طبعی قواعد کے پابند ہیں۔ لیل ونہار کی کروٹیں، شمس وقمر کی گردشیں، ابر و باد کا خرام، نسیمِ سحر کی مہک خیزیاں، موسموں کا تغیر وتبدل، پھولوں کا کھلنا، پھلوں کا پکنا، ستاروں کی تابانی، دریاؤں کی روانی فطرت کے طبعی بندھن میں قید ہیں۔ کسی کا کسی امر میں سرِمُو انحراف ممکن نہیں ہے۔ مگر انسان کو صاحبِ ارادہ اور بااختیار بنایا۔ اُس کے ذمے خدا کی محبت اور عبادت ہے۔ خدا کی محبت کا اظہار مخلوقِ خدا کی محبت میں اور اُن کی خدمت میں پوشیدہ ہے۔ اُردو شاعری کا دامن بھرا پڑا ہے۔ حالی سے لے کر علامہ اقبال تک، مجید امجد سے لے کر احمد ندیم قاسمی تک سب نے اپنے اپنے اسلوب اور اپنے اپنے انداز میں اِس جانب توجہ دلائی ہے۔ حالی لکھتے ہیں:

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہُدیٰ کا — کہ ہے ساری مخلوق کُنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا — خلائق سے ہے جس کو رِشتہ وِلا کا

یہی ہے عبادت، یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں اِنساں کے اِنساں

اِس دنیا کی بنیاد اِختلافِ عمل پر ہے۔ باہمی تعاون سے دنیا کا چلن ہے۔ ہر پیشہ اور ہر منصب یکساں اہمیت کا حامل ہے۔ اِس دنیا میں کوئی جگہ بے محل نہیں اور کوئی شخص بے کار نہیں۔ کنفیوشس ازم کے بانی کے مطابق ''مراعاتِ باہمی'' زندگی کا بنیادی اصول ہے۔ نیکو کاروں سے تعاون اور برائی سے دوری اسلام کا سنہری اصول ہے۔ تین طبقوں سے انسانی زندگی کا حُسن ہے۔ شہید قوم کے لیے جان دیتا ہے۔ محسن قوم کے لیے زندہ رہتا ہے۔ ایک کا صدقہ جان ہے اور دوسرے کا تحفہ زندگی۔ ایک طبقہ اہلِ جمال کا ہے۔ وہ اعلیٰ مصوّر ہو سکتا ہے اور بلند پایہ مقرر یا خطیب بھی۔ وہ ادیب یا شاعر بھی ہوتا ہے اور عمارت گر بھی۔ لیکن میں ایک اُستاد بننا چاہتا ہوں۔ میرا نصب العین روحِ انسانی کی صنعت گری ہے۔ میرے پیشِ نظر پیغمبرِ آخر الزماں ﷺ کا اُسوۂ پاک

ہے ۔آپؐ نے فرمایا: ''اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ۔'' بے شک مجھے معلّم بنا کر بھیجا گیا ہے ۔اسلام میں معلّم جامع حیثیت کا حامل ہے ۔وہ محسن ہے، وہ مربّی ہے، وہ مبلّغ ہے ۔وہ باغبانِ ریاضِ نجات ہے ۔کتابیں تو الفاظ سکھاتی ہیں مگر معلّم انسان سازی کرتا ہے ۔اُس کی شفقت کے سائے بڑے گہرے اور گھنے ہوتے ہیں ۔نوجوان نسل کو صراطِ مستقیم پر لے جانے کا فرض اُستاد کو ادا کرنا ہے ۔نہایت پاکیزہ عمل مگر کٹھن مرحلے، قدم قدم پر رکاوٹیں، نوع بنوع واسطے، اگر حوصلہ ملتا ہے تو رسولؐ اللہ کی سُنّتِ پاک سے ۔سیّد سُلیمان ندویؒ کے بقول: ''اگر تم اُستاد اور معلّم ہو تو صُفّہ کی درس گاہ کے معلم قدس کو دیکھو ۔'' جسے رسولؐ اللہ سے نسبت ہو جائے اُس کے لیے اِس سے بڑھ کر اور سعادت کیا ہوگی ۔سب سے بڑی سعادت ۔

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

معلّم کی حیثیت مسلّم ہے ۔اس کا مقام محترم ہے ۔حضرت علیؓ کا فرمان ہے کہ: ''جس نے مجھے ایک لفظ سکھایا وہ میرا آقا ہے ۔'' اُستاد کا مشن بلند پایہ مشن ہے ۔علامہ اقبالؒ کی نظم '' بچے کی دُعا'' میرے پیشِ نظر ہے ۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری

زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دور دنیا کا مِرے دم سے اندھیرا ہو جائے

ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے

ہو مِرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت

جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

اُستاد ہی وہ ہستی ہے جو اُجالوں کی نوید سُناتا ہے ۔ یاس کے وسوسوں کو آس کے آنگن میں لے کر آتا ہے ۔وہ حیاتِ فانی کو حیاتِ ابدی کا درس دیتا ہے ۔وہ اِقبال کے اِس شعر کی تصویر نظر آتا ہے:

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے　　آتے ہیں جو کام دوسروں کے

تاریخِ اسلام میں ائمہ کرام اور معلّمین کی زندگی حیاتِ انسانی کا زریں باب ہے۔ حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی علمی اور تعلیمی و تدریسی خدمات سے کون واقف نہ ہوگا؟ اُنھوں نے قاضی القضاۃ جیسے عہدوں کو تدریسی فرائض کے سامنے حقیر جانا اور دین کی خدمت پر سرگرمِ عمل رہے۔ مخالفت اور شدائد کے سنگِ گراں اُنھیں اپنے مسلک اور کام سے نہیں روک سکے۔ دنیوی لالچ اور قید و بند کی صعوبتیں اُن کے پائے استقامت میں لرزش پیدا نہ کرسکیں۔

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تُجھے یادگار بنا دیا

مجھے اساتذہ کی زندگی مثالی محسوس ہوتی ہے۔ وہ اپنے قلب و نظر کی قندیل سے قوموں کے افراد کو روشنی عطا کرتے ہیں۔ وہ تہذیبِ نفس کرتے ہیں۔ کہتے ہیں معاشرہ اعلیٰ افراد پیدا کرنے کے بعد بانجھ ہو جاتا ہے۔ پھر یہی ذہین انسان اپنے عجز و اِنکسار، روایات کی پاسبانی اور اعلیٰ اقدار کی پاسداری کرکے نیا معاشرہ تشکیل دیتے ہیں جو اُن کی اُمنگوں کے عین مطابق ہوتا ہے۔ ان افراد میں اُستاد کا شمار صفِ اوّل کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ الغرض اُستاد ہی وہ عظمت ہے جس کے سامنے تخت و تاج جھکتے رہے ہیں۔ وہ حیوان کو انسان اور انسان کو خدا شناس بناتا ہے۔

جاحظ بدشکل مگر علم و عرفان، فلسفہ اور کلام کا ماہر عالمِ بے بدل تھا۔ ہارون الرّشید کے بیٹے امین اور مامون الرّشید کو پڑھاتا تھا۔ جب وہ پڑھا کر رخصت ہونے لگتا تو دونوں شہزادے یک بارگی اُس کے جوتوں کی طرف بھاگتے۔ دونوں کے ہاتھ ایک ایک پاؤں کا جوتا آتا۔ ایک دفعہ ہارون الرّشید نے یہ منظر دیکھا۔ دوسرے دن درباریوں سے پوچھا: ''تمھارے نزدیک سب سے زیادہ خوش نصیب اور معزز فرد کون ہے؟'' دربار میں دنیاداروں اور خوشامدیوں کا مجمع ہوتا ہے۔ سب نے بیک زبان کہا: ''آپ سے بڑھ کر کون ہوسکتا ہے۔'' ہارون الرّشید نے فرمایا: ''نہیں، سب سے زیادہ معزز اور خوش نصیب وہ شخص ہے جس کے جوتے شہزادگانِ وقت اُٹھانے میں فخر اور ثواب

محسوس کرتے ہوں۔

دنیا کی تاریخ میں تحقیق و تدقیق کے تمام امور، علم و فن کے تمام چراغ اساتذہ کے دم سے روشن ہیں۔ برِّ صغیر ہند و پاک کے مزارات آج بھی تعلیم و تربیت کے مراکز ہیں۔ ان بزرگانِ دین کی کوششوں کے سبب یہاں اسلامی علوم کے چراغ روشن ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کے مزارت زندہ اور آباد ہیں جبکہ بادشاہوں کے مقابر ویران اور بے آباد ہیں۔ ایک طرف علامہ اقبالؒ کے مزار پر زائرین کا ہجوم اور شاہی انتظام قابل دید ہے، جبکہ یونینسٹ (Unionist) وزارت کے گورنر سر سکندر حیات خان کی قبر کو کوئی دیکھتا نہیں۔ اہلِ باطن کی قبریں روشن اور پُر رونق ہیں۔ یہ سب اُن کے علم و عرفان کا فیضان ہے۔ مگر افسوس آج اُستاد اپنے فرائضِ منصبی سے کماحقہٗ آگاہ نہیں رہا۔ حالات و واقعات اور وجوہات کچھ بھی ہوں، پھر بھی قوموں کی تقدیر کے معاملے اساتذہ کے ہاتھوں ہی تکمیل پاتے ہیں۔ تعلیم میں تعمیل کے سلسلے معلّمین کی سیرت سے انجام پاتے ہیں۔ میں جب اقبالؒ کی نظم کا دوسرا بند پڑھتا تھا:

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب! — علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب!
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا — دردمندوں سے، ضعیفوں سے محبت کرنا
میرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو — نیک جو راہ ہو اُس رہ پہ چلانا مجھ کو

تو معلّم بننا میرا نصب العین ٹھہرا۔ اُستاد بن کر قوم کی خدمت کرنا میرا نصب العین ہے۔ یہی وہ راہ ہے جسے صراطِ مستقیم کہنا مناسب ہوگا۔ صراطِ مستقیم تو ہر شعبۂ خدمت میں موجود ہے لیکن یہ شعبہ سب کا ہادی اور بنیادی شعبہ ہے۔ صراطِ مستقیم کے تمام راستے اِسی راستے سے نکلتے ہیں۔ معلّمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فخر رہا۔ ''مجھے معلّم بنا کر مبعوث کیا گیا''۔ اِس سے بڑھ کر معلّم کی نسبت کیا ہوگی۔

☆☆☆☆☆☆

قومی زبان

زبان انسانی عمل کا نمونہ ہے۔علم اللّسان،علم الانسان سے رابطہ رکھتا ہے۔''عَلَّمَهُ الْبَيَانَ''انسان کا شرف ہے۔اِس میں مادری زبان کے سکھانے کی طرف اِشارہ ہے۔ہر بچہ سب سے پہلے مادری زبان سیکھتا ہے۔زبان زندہ قوموں کی زندگی،تہذیب وتمدّن اور ثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔اِسی طرح زبانوں کی تاریخ میں قوموں کی زندگی اور زندگی کی تاریخ پنہاں ہوتی ہے۔تحریکِ پاکستان کی روح میں دو بڑے مقاصد نمایاں تھے،ایک اسلام کا نفاذ اور دوسرا ''اُردو زبان کی بقا۔''لیکن بقول مختار مسعود''تحریکِ پاکستان کا مقصد تو''فکرِ فردا''تھا مگر خونِ تمنّا ہوا۔اسلام کے نفاذ اور اُردو زبان کے مقاصد ابھی شرمندۂ تکمیل ہیں۔

یوں تو ہمارے ہاں ہر قومی چیز''ہاکی''قومی کھیل''نرگس''قومی پھول اور''اُردو''قومی زبان کی وہ قدر نہیں کی گئی جن کی وہ حق دار تھیں،مگر ناامیدی کفر ہے۔اب اِس طرف پیش رفت جاری ہے۔سپریم کورٹ آف پاکستان کا فیصلہ بھی مثبت رخ کی طرف اشارہ ہے۔یوں بھی زبانیں قوموں کے لیے آبِ حیات کی طرح ہیں۔انسانی روح کے لیے ایسا پاک چشمہ ہے جو اس کی ترقی کی آبیاری کرتا ہے۔اور جس میں قوموں کے افراد اپنی تمنائیں،امیدیں،تجربے،سوچ،تخیّل اور مطالعے کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ہم نے آج تک اپنی قومی زبان اُردو کو وہ مقام نہیں دیا جو اس کا حق تھا۔اِس لیے ہم ترقی کی منازل طے نہیں کر سکے۔ممکن ہے لوگ اِس تنزلی کی اور بھی وجوہات بیان کریں مگر اِس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جب تک طالب علم متن سے آگاہ نہ ہوگا،وہ اظہارِ خیال پر قادر نہ ہوگا۔دیگر زبان میں اظہارِ خیال مشکل ہوتا ہے۔تاخیر سے ہوتا ہے اور بہت محنت طلب ہوتا ہے۔جس کے ہم خوگر بھی نہیں ہیں۔کیا خوب شعر ہے۔شاعر نے روایتی محبوب کے لیے کہا ہوگا مگر ہمارے موقف کے بھی حسبِ حال ہے:

****

پیام بر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا

زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

زبانِ غیر میں اظہارِ خیال ممکن نہیں۔تاریخ شاہد ہے اور حال گواہ ہے کہ چین، فرانس، روس اور جاپان جیسے ترقی یافتہ ممالک نے اپنی اپنی قومی زبانیں اپنا کر اور اُنھیں اپنا ذریعہ تعلیم بنا کر ہی ترقی کی منازل اور سفر طے کیا ہے۔پھر ہم کیوں زبانِ غیر پر مُصر ہیں؟ ہمارے اِس اِصرار میں مصلحت بینوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ہمارا انگریزی خواں اور انگریزی دان طبقہ اپنے ذاتی مفادات کی خاطر مختلف طرح کے حیلے بہانے کر کے یہ طوقِ غلامی پہنے ہوئے ہے۔اور باقی قوم کو بھی اس عذاب میں مبتلا رکھے ہوئے ہے۔مرزا محمود سرحدی کو اِس کا گہرا اِدراک ہے:

اے ساقیِ گلفام بُرا ہو ترا، تُو نے باتوں میں لُبھا کر ہمیں وہ جام پلایا
یہ حال ہے، سو سال غلامی میں بسر کی اور ہوش ہمیں اب بھی مکمل نہیں آیا

انگریزی زبان کو سینے سے لگائے ہمیں عرصہ گزر چکا مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔

مدارس اور مکاتب کی تعلیم نے حالی اور شبلی پیدا کیے مگر علی گڑھ کوئی حالی اور شبلی پیدا نہ کر سکا۔مختار مسعود لکھتے ہیں: وہ دس سال بھی کیا منتخب سال برس تھے مگر اس کے بعد نہ فرزانے پیدا ہوئے نہ دیوانے۔ہماری تعلیم تو تاجر اور بیوروکریٹ پیدا کرتی رہی۔کوئی اقبال اور قائدِ اعظم پیدا نہ کر سکی۔ہماری کیفیت تو وہ ہی ہے:

نہ خدا ہی ملا ، نہ وصالِ صنم

نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے

ہمارا حال تو یہ ہوا:

ایک تھا تیتر ایک بٹیر، لڑنے میں تھے دونوں شیر
لڑتے لڑتے ہوگئی گم، ایک کی چونچ اور ایک کی دم

پطرس بخاری نے بڑے مزے اور پتے کی بات کی تھی:

****

''ہمارے ادیب دولسانی کشمکش میں معلّق ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہم بھی دولسانی اور انگریزی کے رعب میں مبتلا ہیں۔ نہ تصوّرات واضح، نہ خیالات ارفع۔ ہمارا وقت، سرمایہ، توانائیاں سب انگریزی زبان کی نذر ہوگئی ہیں۔'' ترقی کا سفر معکوس ہے۔ 75 سال تک منزل کا تعیّن نہیں ہوا۔ ہمارے مراعات یافتہ طبقات کی منزل مغرب ہے۔ مکان مغرب میں، علاج مغرب میں، مزار مغرب میں، اجلاس مغرب میں اور حکومت پاکستان میں۔ یہ تضاد کیسا ہے؟ جناب! غور فرمائیں۔

اُردو بے شک ہماری وحدت کی علامت ہے۔ یہ ہماری تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار ہے۔ یہ ہماری قومیت کی بنیاد ہے۔ ہمارے اظہارِ خیال کا ذریعہ بلکہ ہماری زندگی اور بقا کا لازمی عنصر ہے۔ بقول مولوی عبدالحق: ''قومیت کے لیے یک رنگی کی، یک رنگی کے لیے ہم خیالی کی، ہم خیالی کے لیے ہم لسانی کی ضرورت ہے۔ جہاں خیال ایک ہو گا وہاں زبان ایک ہوگی۔ جہاں زبان ایک ہوگی وہاں وحدتِ قومی پیدا ہوگی۔ یہ دلوں کو جوڑتی ہے اور بیگانوں کو یگانہ بناتی ہے۔''

قوم کے رخِ برگِ گل کو نکھارنے، سنوارنے میں اُردو کی خدمات کسی اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔

اُردو کے چاند کے ہیں اُجالے کرن کرن
مہکے ہیں اِس کے عنبریں گیسو شکن شکن
پھرتی رہی ہے مثلِ صبا یہ دمن دمن
اُردو نے اپنا خون دیا ہے چمن چمن
اب کا نہیں ہے ساتھ، یہ صدیوں کا ساتھ ہے
تشکیلِ ارضِ پاک میں اُردو کا ہاتھ ہے

جو قومیں اپنے کیلنڈر کی تاریخ بھول جاتی ہیں، قومیں اُن کی تاریخ اور تہذیب کو بھلا دیتی ہیں۔ (ٹائن بی)

زبانوں کا معاملہ بھی عجب معاملہ ہے کہ عربی زبان کی سرپرستی اور اس کے قواعد و ضوابط کی تدوین میں اہلِ فارس کا ہاتھ رہا۔ فارسی زبان کو بنانے، سنوارنے اور نکھارنے میں اہلِ ہند شامل رہے۔ اُردو زبان کی سرپرستی میں اہلِ انگلستان کی کوششیں کسی سے پوشیدہ نہیں۔ فورٹ ولیم کالج اور اُردو کا چولی دامن کا ساتھ رہا۔ اُن کی سرپرستی میں متعدد ذخیرہ اُردو زبان میں جمع ہوا۔ اُردو کی خوبی یہ کہ مختلف زبانوں اور بولیوں کے میل جول سے اُبھری ہے۔ ہر زبان پر اس کا رنگ غالب رہا۔ یہ کسی زبان میں گم نہیں ہوئی بلکہ اپنا رنگ اختیار کیا۔ یہ ہند آریائی زبانوں کے ارتقا سے وجود میں آئی۔ عربی کی گود میں پلی۔ فارسی کا دودھ پی کر جوان ہوئی۔ السنہ یورپ سے آنکھیں ملانے کے قابل ہے۔ دنیا کی چار ہزار بولی جانے والی زبانوں میں اِس کا تیسرا نمبر ہے۔ اِس میں ہندی کی حلاوت، فارسی کی شیرینی و روانی، عربی کی شوکتِ الفاظ، انگریزی زبان کی آمیزش، اس کی لوچ، ملائمت، حسن اور بانکپن بے نظیر ہے۔ یہاں یہ اعتراض بھی بے بنیاد معلوم ہوتا ہے کہ یہ سائنسی مضامین کے ترجمے کی متحمل نہیں ہوسکتی، یا اس میں سائنسی علوم کی تدریس ممکن نہیں۔ سرسیّد احمد خان سے پہلے اُردو زبان محض داستانوں اور خطوطِ غالب سے آگے نہ بڑھ سکی تھی۔ تحریکِ علی گڑھ نے اُردو ادب کو ذرے سے آفتاب بنا دیا۔ اس میں ہر طرح کے خیالات کے اظہار کی گنجائش پیدا کر دی۔ ہر سطح کے مضامین لکھے گئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے 1917ء سے 1948ء تک کے مختصر زمانے میں میڈیکل، انجینئرنگ، ایم۔ ایس۔ سی اور ایم۔ اے کے تمام مضامین کو اُردو کے ذریعے پڑھا کر اور اس تجربے کو کامیاب بنا کر ثابت کر دیا کہ اُردو زبان کے علمی مرتبے سے چشم پوشی کرنا اور اس کی صلاحیتوں میں شک کرنا کوئی معقول بات نہیں ہے۔ اُردو کا اِسلام سے بھی گہرا واسطہ ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں اسلام سے متعلق اِتنا سرمایہ نہیں جتنا اُردو زبان میں موجود ہے۔ ہماری تمام مخالف کوششوں کے باوجود پاکستان میں اُردو میں چھپنے والے اخبارات کی تعداد انگریزی اخبارات سے کہیں زیادہ ہے۔

ہم اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنا کر نوجوانوں کے لیے آسانی پیدا کر سکتے ہیں۔ اُن کی محنت

کے نتائج بہتر صورت پیدا کریں گے اور اُن کی تفہیم کا عمل آسان ہوگا۔ اِظہار پر قدرت ہوگی، بیان میں نُدرت کا رنگ بکھرے گا۔ علوم کی بھی خدمت ہوگی۔ عوام الناس کو علوم تک رسائی حاصل ہوگی۔ شرح خواندگی میں خاطر خواہ اِضافہ ہوگا۔ اعلیٰ قسم کی لیڈر شپ پیدا ہوگی۔ اُن کے خیالات، افکار ہم دوشِ ثریا ہوں گے۔ اپنی مادری زبان میں خیالات اور تصوّرات واضح اور پختہ ہوتے ہیں۔ زبان معاشرے کی پیداوار ہے۔

زبان کی اہم ترین کلیاں اُن شاخوں پر پیدا ہوتی ہیں جو خود بخود جنم لیتی ہیں۔ بغیر کسی سہارے کے پروان چڑھتی ہیں۔ عالم فاضل ماہرین زبان کو مایہ دار، لطیف، دل پذیر اور کومل تو بنا سکتے ہیں۔ تخلیقی عمل خود بخود وجود میں آتا ہے۔ اگر ہم وقار اور خود داری کی زندگی بسر کرنے کے خواہاں ہیں تو اپنی قومی زبان کو تعلیمی، سرکاری، قومی، عدالتی، ہر سطح پر نافذ کرنا ہوگا۔

بعض احباب کو اعتراض ہے کہ سائنسی اصطلاحات کا ترجمہ اور تدریس اِس میں ممکن نہیں۔ بھئی! دریا میں اُترو گے تو تیرنا آئے گا۔ ساری زندگی ساحل پر کھڑا رہنے سے پیراکی نہیں آسکتی۔ اس کے لیے قدم اُٹھانا ہوگا۔" باقی اُردو زبان میں بہت صلاحیت ہے۔ بس نیت اور اِرادے کا درست ہونا ضروری ہے۔ ہر مشکل آسان اور ہر مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ آؤ عہد کریں، آگے بڑھیں! اور اُردو کے .... گیسو جو منت پذیرِ شانہ ہیں کو سنواریں۔ اپنی فلاح اور بقا کی طرف قدم بڑھائیں۔

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

قومی تہذیب کی عمارت زبان کی بنیاد پر چنی جاتی ہے۔ ادب میں حُسن و خوبی کا آخری معیار صداقت یا حقیقت ہے۔ اچھا اُستاد دُنیا کی بہترین نعمتوں میں سے ہے۔

اُردو اگرچہ خاص خطے کی زبان نہیں۔ پنجابی، سندھی، بروہی اور پشتو کی طرح یہ کسی خاص خطے سے مخصوص بھی نہیں۔ پھر بھی برِّ صغیر ہندو پاک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں بالعموم اور ارضِ

****

پاکستان کا سارا خطہ بالخصوص ایسا نہیں ہے جہاں یہ زبان بولی اور سمجھی نہ جاتی ہو۔ یہ وادیوں اور کوہ ودمن میں بھی، خیبر پختون خوا کے لالہ زاروں میں، سندھ کے ریگ زاروں میں، پنجاب کے سبزہ زاروں میں، شہروں اور دیہات میں، دور اُفتادہ علاقوں، گلگت اور بلتستان میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ نا آشناؤں کے درمیان آشنائی پیدا کرتی ہے۔ٹوٹے ٹکڑوں کو جوڑنے اور بکھرے دانوں کو یک جا کرنے کا مقدس فرض انجام دیتی ہے جو ہماری وحدت کی علامت اور رابطہ کا ذریعہ ہے۔

زندہ وطن میں روحِ ثقافت اِسی سے ہے
آزادیِ وطن کی علامت اِسی سے ہے

☆☆☆☆☆☆

****

قومی راہ نما
(میری پسندیدہ شخصیت)

پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا۔جس طرح یہ کائنات مجموعہ اضداد ہے ایسے ہی زندگی اضداد و تضادات کا مرقع ہے۔تخلیق میں تضادات نفرت کے لیے نہیں، پہچان کے لیے ہیں۔جو چیز جس قدر مختلف ہے اُسی قدر ضروری بھی: محبت اختلاف کو ختم کر دیتی ہے۔وہی اختلاف باعثِ حُسن ہے۔

''گل ہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن''

میری پسندیدہ شخصیت ''ایوانِ سیاست کے شاہ سوار''، بابِ پاکستان:

نِگہ بلند ، سخن دل نواز ، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

اور بقول میاں بشیر احمد:

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناحؒ
ملت ہے جسم جاں ہے محمد علی جناحؒ

ہیں۔

۱۹۴۲ء کا ذکر ہے جب علی گڑھ کالج یونیورسٹی کا سٹریچی ہال ہجوم سے اور ہجوم جذبات سے بھرپور تھا۔پروفیسر اے۔بی۔حلیم صدر شعبہ تاریخ جلسے کی صدارت فرما رہے تھے۔اُنھوں نے قائدِاعظم سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ: ''جنابِ قائدِاعظم! مجھے آپ سے ایک نسبت ہے۔میں آج کل تاریخ پڑھا رہا ہوں اور آپ آج کل تاریخ بنا رہے ہیں۔میں تاریخ کا طالب علم ہوں اور آپ سیاسیات کے اُستاد۔'' اُس روز اُن کی زبان سے یہ برجستہ جملہ نکلا اور تاریخی ہو گیا۔

چرچل کے بارے میں کسی گمنام مصنف نے پیش گوئی کی تھی کہ ایک دن یہ نوجوان

شاید انگلستان اور اس کی شکست کے درمیان حائل ہو جائے گا۔ مگر کسے خبر تھی کہ ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء، اتوار کی صبح کو جناح پونجا کے گھر پیدا ہونے والا دبلا پتلا اور لاغر بچہ نہ صرف تاریخ کا رخ تبدیل کر دے گا بلکہ دنیا کا جغرافیہ بھی بدل کر رکھ دے گا۔ یہ اُن کی ریاضت کی کرامت تھی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک ظہور پذیر ہوا۔ جو اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست تھی۔ آبادی کے اعتبار سے دُنیا کا پانچواں بڑا ملک۔

ڈاکٹر ندیم شفیق نے اپنی کتاب میں لکھا ہے: ''جب ایک قوم کو اپنی قیادت پر اعتماد ہوتا ہے تو تحریکِ پاکستان جیسے معجزے رونما ہوتے ہیں۔ قائدِ اعظم نے ہمیں مستقبل عطا کیا تھا۔'' اُن کے فرمان بڑے روشن ہیں۔ اُن کا کہنا ہے: ''میرا آپ کو مشورہ ہے کہ لیڈروں کے انتخاب میں ہمیشہ احتیاط کریں۔'' آدھی جنگ تو لیڈروں کے انتخاب ہی سے جیت لی جاتی ہے۔''

(۱۱ جولائی ۔ ۱۹۴۶ء)

پھر فرمایا: ''آزادیِ اِظہار کے بغیر کسی قوم کی حالت گلاب کے اُس پھول کی سی ہے جو ایسی جگہ اُگا ہو جہاں نہ اُسے دھوپ ملتی ہو اور نہ ہوا۔''

مغربی طرزِ تمدّن اور طرزِ حکومت کے بارے میں اُن کے نظریات اور علامہ اقبالؒ کے نظریات میں گہری مطابقت ومماثلت ہے۔ اُن کا اِرشاد ہے: ''مغرب میں اختیار کیے جانے والے معاشی نظام نے انسانیت کے لیے نہ ختم ہونے والے مسائل پیدا کیے ہیں۔ یہ نظام انسانوں میں انصاف اور بین الاقوامی سطح پر کشیدگی ختم کرنے میں ناکام ہوا ہے۔''

شخصیت کا وہ پھول جو قائدِ اعظم نے اپنے خلوص، مسلسل جدوجہد اور حُسنِ عمل سے اپنے پانچ فٹ ساڑھے دس انچ ((5.10.1/2 دبلے جسم پر ٹانک لیا تھا۔ محنت اور قومی درد کی لگن میں 112 پونڈ وزن اونس اونس کر کے کم ہو رہا تھا۔ ہر وقت اُنھیں قوم کی فکر تھی۔ فاطمہ جناح کا کہنا ہے کہ اُنھوں نے مجھ سے کہا: ''میں اپنی جسمانی طاقت کی کان کھود کر توانائی کا آخری اونس اونس تک ڈھونڈ نکالوں گا اور اُسے اپنی قوم کی خدمت میں صرف کر دوں گا۔ جب وہ بھی ختم ہو جائے گا تو

میرا کام مکمل ہو چکا ہوگا۔‘‘

وہ قوم کو ایک منزل کی طرف لے جانا چاہتے تھے جو قوم کی فلاح کی منزل ہے۔منزلِ مراد شاد باد۔لوگوں کو اُن کے خلوص اور دعوے کی صداقت پر مکمل یقین تھا۔بقول کسے :

میں نے پوچھا تھا کہ اخلاص کسے کہتے ہیں
ایک بچہ تری تصویر اُٹھا لایا ہے

قائدِاعظم کی شخصیت کے نمایاں پہلو ملاحظہ ہوں۔اُنھوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔کبھی وعدہ خلافی نہیں کی۔کسی تقریب میں کبھی تاخیر سے نہیں پہنچے۔ارادہ پختہ اور مزاج مستقل۔وہ انمول تھے۔کوئی تحریص یا ترغیب اُنھیں راغب نہیں کرسکتی تھی۔ہزار خوف مگر زبان دل کی رفیق تھی۔’’بے شک ایسے لوگ انعام کے طور پر عطا ہوتے ہیں اور سزا کے طور پر روک لیے جاتے ہیں۔‘‘

اسٹینلے والپرٹ:’’تاریخ کا اُستاد،خود تاریخ بن گیا۔ ۱۹۸۴ء میں اپنی معروفِ زمانہ کتاب’’جناح آف پاکستان‘‘(Jinnah of Pakistan) میں لکھتا ہے:’’محض چند ہی شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو تاریخ کا دھارا تبدیل کر دیتی ہیں۔ایسے افراد تو محض مٹھی بھر ہوتے ہیں جو دنیا کا نقشہ تبدیل کر دیں اور ان لوگوں کی تو شاید آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ ہوتی ہو جنھیں قومی ریاست تشکیل دینے کا اعزاز حاصل ہوا ہو۔مگر محمد علی جناح نے یہ تینوں کام سر انجام دیے۔

"Few individual signifantly alter the course of history. Fewer still modify the map of the word. Hardly anyone, can be credit with creating a nation-state. Mohammad Ali Jinnah did all three."

اُنھوں نے تاریخ کا دھارا بھی بدلا ۔دنیا کا نقشہ بھی تبدیل کیا اور ایک نئی اسلامی ریاست بھی قائم کی۔

دیکارت کا کہنا ہے کہ میں سوچتا ہوں لہٰذا میں ہوں۔جب کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک

میں کرتا ہوں لہٰذا میں ہوں۔قائدِ اعظمؒ نے جو سوچا وہ کہا، جو کہا وہ کر دِکھایا۔یہ تھا ہماری تاریخ کا ایک روشن باب جب الاؤ بھڑکا اور چراغاں ہوگیا۔قوم کو منزلِ مراد تو مل چکی تھی، مگر اسلامی فلاحی ریاست کا تصوّر ابھی باقی تھا۔زندگی کے آخری دس برس کے دوران اُن کی سیاسی سرگرمیوں اور ذمہ داریوں میں کئی گُنا اِضافہ ہوگیا تھا۔ڈاکٹروں کے مشورے اور چھوٹی بہن کی التجاؤں کے باوجود اُنھوں نے اپنی صحت کا کوئی خیال نہ رکھا۔فاطمہ جناح لکھتی ہیں کہ مجھے کہا کرتے تھے: ''کیا تم نے کبھی سُنا ہے کہ کسی جنرل نے چھٹی کی ہو۔'' وہ اکثر کہا کرتے تھے: ''فردِ واحد کی صحت کی کیا حیثیت ہے۔جب کہ میں ہندوستان کے دس کروڑ عوام کی بقا کے بارے میں پریشان ہوں۔ وزن اونس اونس ختم ہو رہا تھا مگر اُنھیں قوم کی فکر تھی۔آخر وہی ہوا۔2 بجے اُنھیں کوئٹہ سے روانہ کیا گیا۔4:15 بجے ماڑی پُور، دو گھنٹے کی تاخیر سے 6:15 بجے گورنر جنرل ہاؤس پہنچے۔پھر گہری نیند سو گئے۔فاطمہ جناح لکھتی ہیں کہ میں نے وجدانی طور پر محسوس کیا کہ یہ آخری سنبھالا کی نیند ہے۔شمع کے اس آخری شعلے کی مانند جو بجھنے سے پہلے زیادہ نمایاں اور بھرپور ہوا کرتا ہے۔میں نے دعائیں بھی کیں اور التجائیں بھی۔وہ کسی خلل کے بغیر تقریباً دو گھنٹے تک گہری نیند سوتے رہے۔پھر اُنھوں نے آنکھیں کھولیں۔مجھے دیکھا اور سر اور آنکھوں کے اِشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اُنھوں نے بات کرنے کی آخری کوشش کی اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگے: ''فاطی! خدا حافظ؛ لاالٰہ الا اللہ ... محمد رّسول ... اللہ۔'' اُن کا سر آہستگی سے قدرے دائیں جانب ڈھلک گیا۔اُن کی آنکھیں بند ہوگئیں۔یوں ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء بروز ہفتہ قوم یتیم ہوگئی اور قوم کا محسن قوم سے جدا ہوگیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ڈاکٹر آئے۔اُنھیں سفید چادر اوڑھا دی۔اُن کے آنسوؤں نے ایک ایسی زبان میں مجھ تک وہ مہلک خبر پہنچا دی جس میں الفاظ ہوتے ہیں نہ زبان۔لوگوں کا ہجوم گورنر جنرل ہاؤس میں داخل ہوا۔مجھے کچھ خبر نہیں میں کب تک وہاں بیٹھی رہی۔بس مجھے اِتنا یاد ہے کہ ایک بوڑھی خاتون جسے

میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا نہ میں اُسے جانتی تھی، اُس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال کر چپکے سے میرے کان میں قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی:

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔"

قائدِ اعظم بھی نہ رہے۔ مگر اُن کی یادیں باقی ہیں، اُن کے تذکرے رواں، اُن کے دِیے وطن کو اللہ شاد ماں اور خوش حال کر دے۔"اسلامی فلاحی ریاست" اُن کا دِیا ہوا تصور شرمندۂ تعبیر ہو۔ جوں جوں وقت گزرے گا اُن کی محنت اور فراست کے راز کھلتے چلے جائیں گے۔ قائدِ اعظمؒ کی شخصیت اور پاکستان کے قیام کے لیے اُن کی کوششوں اور مسلسل جدوجہد پر بہت سی کتب منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ تفصیل کے لیے اُن کتب کے مطالعہ کی سفارش کی جاتی ہے۔

قومی ترقی ...... اور نوجوان

نوجوان قوموں کے ماتھے کا جھومر، اُن کے شباب کی علامت، قومی ترقی کے لیے ریڑھ کی ہڈی، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی رونق، کوچہ و بازار کی زینت .... تحریکاتِ آزادی کا حُسن اور انقلابات کے دل کی دھڑکن، وطن کی سرحدوں کے محافظ اور فتوحاتِ عالم کے سلسلے اس مرکز و محور کے گرد گھومتے ہیں۔

کہیں پڑھا تھا: ''حضرت موسیٰؑ کو اُن کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا۔''

پھر رحمتِ عالمؐ کے ماننے والوں میں اوّلیت کا شرف نوجوانوں کو حاصل ہوا۔ بیس سال سے کم عمر میں حضرت علیؓ، حضرت جعفر طیّارؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے نام آتے ہیں۔ جب کہ ۲۰ اور ۳۰ سال کے درمیان کی عمروں والے نوجوانوں میں صہیب رومیؓ، بلال حبشی، عبدالرحمنؓ بن عوف، حضرت عثمانؓ بن عفّان، حضرت عمرؓ، اور زیدؓ بن حارثہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نام آتے ہیں۔

''اخوان الصّفا'' والوں کا کہنا ہے: ''فرسودہ بوڑھوں کی اصلاح میں کوشاں نہ ہوں۔ سلیم الطبع نوجوانوں کو نصیحت کریں۔'' اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو جوانی میں نبوت عطا کی۔

قرونِ اُولیٰ میں بات اُسامہ بن زیدؓ کی لشکرکشی کی ہو یا محمد بن قاسم (سترہ سالہ نوجوان سپہ سالار) کی فتح سندھ کی۔ بات راشد منہاس کے سینے پر تمغۂ شہادت کے سجنے کی ہو یا چونڈہ کے محاذ پر بم باندھ کر وطن عزیز کی حفاظت کرنے والے فوجی جوانوں کے جذبۂ شہادت کی۔ یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یوں تو ہر مرحلۂ زندگی قوموں کی تقدیر میں اہم کردار کا حامل ہوتا ہے لیکن معاشرے میں انقلاب لانے کے لیے قوموں کی نظریں نوجوان طبقے کی طرف ہی اُٹھتی ہیں۔ انقلاب روس کا ہو یا فرانس کا یا پھر حصولِ پاکستان کی جدوجہد کا۔ نوجوان ہی ایسی تحریکوں کو

کامیابی سے ہم کنار کرتے ہیں۔ظفر علی خان نے اس امید اور روشن مستقبل کی طرف ایسے اشارہ کیا تھا:

اِن کواکب کے عوض ہوں گے نئے انجم طلوع
اِن دِنوں رخشندہ تر یہ آسماں ہو جائے گا
نغمہ آزادی کا گونجے گا حرم اور دَیر میں
وہ جو دارالحرب ہے دارالاَماں ہو جائے گا

شاعرِمشرق، حکیم الامت، علامہ محمد اقبالؒ تاریخِ عالم سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔اُن پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ (تیس پینتیس سال کی عمروں میں) دعوتِ حق کی پکار پر لبیک کہنے والوں میں نوجوان ہی پیش پیش رہے۔ اِس لیے علامہ اقبال کی شاعری سے اِس قسم کی بہت سی نادر مثالیں دی جا سکتی ہیں:

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

اور

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ، ضرب ہے کاری

پھر کبھی دُعائیہ لہجہ لیے ایک پکار اُن کے اُفق شاعری سے اُبھرتی ہے۔

جوانوں کو میری آہِ سحر دے پھر اِن شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے مِرا نورِ بصیرت عام کر دے

اور بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کے الفاظ:

"You are the builder of Pakistan and father of the future nation." اِسی حقیقت کے مظہر ہیں۔

بے شک اُستاد "باغبانِ ریاضِ نجات" ہے لیکن اُس کی محنت، تربیت، رہنمائی کے

جوہر اور قیادت و سیادت کے تمام تر سلسلے اور مرحلے جوانوں کی صلاحیتوں کے مرکز کے گرد ہی گھومتے ہیں۔طلبہ معاشرے کا قابل قدر اور حسّاس طبقہ ہیں۔''آج کا بچہ کل کا باپ'' کے مصداق انھی کو ملک کا مستقبل سنبھالنا ہے۔تاریخ کی نگاہیں اُن پر مرکوز ہیں۔قوم کی اُمیدیں اُن سے وابستہ ہیں۔قومی ترقی کا انحصار اُن کی صالح تربیت پر ہے۔صالح اور باصلاحیت نوجوان ہماری بہترین متاع ہیں۔اُن کا فکر و عمل تاریخ مرتب کرتا ہے اور قوموں کی تقدیر بدلتا ہے۔وہ فی الواقع ملت کے مقدر کا ستارہ ہیں۔بقول اقبالؒ:

عقابی روح جب بے دار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں

اور نظم ''جاوید نامہ''، میں جسے فکرِ اقبال کی معراج کہنا چاہیے،نصیحت کے انداز میں لکھتے ہیں:

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر — نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو — سکوتِ لالہ و گل میں کلام پیدا کر
اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں — سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے — خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

اقبالؒ کے عروجِ شاعری کے زمانے کے ایک نوجوان شاعر مجاز لکھنوی لکھتے ہیں:

جلالِ آتش و برق و سحاب پیدا کر — اجل بھی کانپ اُٹھے وہ شباب پیدا کر

یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ:

اُس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

وہ جوانوں کو نئی فکر عطا کرتے ہیں:

ترا شباب امانت ہے ساری دنیا کی — تو خارزارِ جہاں میں گلاب پیدا کر

لیکن افسوس! صد افسوس!

لہو برسا، بہے آنسو، لُٹے راہرو، کٹے رِشتے
ابھی تک نامکمل ہے مگر تعمیرِ آزادی

ہمارے تن آسان طلبہ، منزل سے دور، بھٹکے ہوئے نوجوان، امن وسلامتی اور تعلیم و تربیت کی درس گاہوں سے دہشت گردوں کی برآمدگی، امن اور سکون لوٹنے والے عناصر۔ آج کی نسل مجلسی زندگی سے کٹ کر موبائل فون کی خلوت میں بند ہوگئی ہے۔ سوتے میں بھی اُن کے لحافوں سے چنگاریاں سی اُبھرتی نظر آتی ہیں۔ اقدار کی جگہ بے راہ روی، اخلاقیات کے بجائے مادیت، جرائم کی بڑھتی ہوئی شرح اور اُن میں جوانوں کی بڑھ چڑھ کر شرکت اور شمولیت...... ہوسِ زر کی خاطر انسانی جذبات اور انسانی خون کی ارزانی، مادیت کے طوفانِ بدتمیزی میں بہتا ہوا یہ نوجوانوں کا سیل رواں، اب تو احساس ہوتا ہے کہ ہم زندہ قوم کی بجائے شرمندہ قوم ہیں۔ یہاں معاملہ صرف جوانوں کا ہی نہیں بلکہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ تعلیمی نظریات کی تخریب نے معاملہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ ڈالر کی چمک اور رہنماؤں کے چلن نے قوم کو اور اِس قوم کے نوجوان طبقے کو جرائم کی دہلیز پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ بقول شاعر:

رہزنوں سے تو بھاگ نکلا تھا اب مجھے رہبروں نے گھیرا ہے

یہاں بات قنوطیت کی نہیں، حقائق سے پردہ کشائی کی ہے۔

سازِ ہستی سے نکلتے ہیں سسکتے نغمے
مطربِ دہر کی بے کیفیِ نغمات نہ پوچھ
چشمِ حق بیں سے ذرا دیکھ لیا تھا نُزہت
کیسے اُٹھے تھے حقیقت کے حجابات نہ پوچھ

لیکن مایوسی کفر ہے۔ ”لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللهِ“ یہ ملک وسائل سے بھرپور ملک ہے۔ باصلاحیت جوانوں کی ارضِ پاک۔

”کم کوش تو ہیں بے ذوق نہیں راہی“

وطن عزیز کی برف پوش چوٹیاں، سرسبز و شاداب وادیاں، بہتے دریا، رواں چشمے، سندھ کے ریگ زار، سرحد کے سونا اُگلتے پہاڑ، بلوچستان کے چاغی ہلز، پنجاب کے سبزہ زار، جوانوں کی 45% آبادی (جس سے مغرب خوف زدہ ہے)، یہ بلند و بالا پہاڑی سلسلے، بہترین موسموں کی آماج گاہیں، میلوں تک پھیلے صحرائی اور ریگستانی علاقے، وسیع و زرخیز میدان، لہلہاتے کھیت، باغات، رنگ رنگ کی نعمتیں اور جلوہ سامانیاں۔

چاند میری زمیں، پھول میرا وطن　　　میرے کھیتوں کی مٹی میں لعل یمن

سب چیزیں جوانوں کی راہ دیکھ رہی ہیں۔ اُن کے جذبوں اور پاکیزہ ولولوں کو دعوتِ عمل دے رہی ہیں کہ آگے بڑھو اور وطن کی ترقی کے گیسو سنوارو۔ لیلیٰ وطن کی ہر اَدا پر مر مٹو۔

آؤ اپنے جسم چن دیں اینٹ پتھر کی طرح
بے در و دیوار ہے لیکن یہ گھر اپنا تو ہے

کیونکہ:

ہم ہیں ارضِ پاک کے ذروں کی حُرمت کے امیں
ہم ہیں حرفِ لا الٰہ کے ترجمانِ بے خطر

آئیں تجدیدِ عہد کرتے ہیں کہ ہم اپنے باوضو عمل اور اچھوتے شباب کو وطن عزیز کی آن پر نچھاور کریں گے۔

خونِ دل دے کے نکھاریں گے رخِ برگِ گلاب
ہم نے گلشن کے تحفّظ کی قسم کھائی ہے

☆☆☆☆☆☆

اسلام مکمل ضابطۂ حیات

اسلام مذہب ہی نہیں بلکہ دین ہے۔ایسا دین جو دوسرے ادیان پر غالب ہے اور ہر لحاظ سے مکمل بھی۔دین اسلام کا آغاز تو حضرت آدمؑ سے ہوا ہے،اِس کی تکمیل نبی آخرالزّماں حضرت محمدﷺ پر ہوئی۔ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دینا (المائدہ: آیت ۳) یعنی’’ آج پورا کر چکا تمھارے لیے دین تمھارا اور پورا کیا تم پر احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمھارے واسطے اسلام کو۔‘‘

اِسلام ضابطۂ حیات ہے۔اِس کا دائرہ مذہب و روحانیت اور اخلاق و معاملات کے ساتھ ساتھ سیاست،معیشت اور قانون تک وسیع ہے۔اسلام پر ایمان لانے کے بعد کوئی مسلمان اس کی سیاسی،تہذیبی،اخلاقی،قانونی اور معاشی تعلیمات سے انحراف نہیں کرسکتا۔اسلام اللہ کی وحدانیت اور توحید کا اعلان ہے۔کسی طرح کے شرک کا شائبہ اس میں ممکن نہیں۔یہ دین اللہ کا بھیجا ہوا ہے۔اس دین میں صرف عبادات کا نظام ہی نہیں بلکہ زندگی کے چاروں سنہری ابواب (عقائد،عبادات،اخلاق اور معاملات) کو محیط ہے۔یہ صرف اللہ کے حقوق اور بندے کے فرائض کی بات نہیں کرتا بلکہ حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد اور حقوق النفس بھی اس کی جامعیت و اکملیت کی دلیل ہیں۔اللہ کی توحید کے بعد رسولوں کی رسالت،فرشتوں اور الہامی کتابوں پر ایمان کے بعد قضا و قدر اور یومِ آخرت پر یقین کی بات بھی کرتا ہے۔آخری پیغمبر حضرت محمدﷺ کا اُسوہ حسنہ بھی اور کامل بھی۔یہی معیارِ حق ہے۔اُن کی اتباع اللہ کی محبت کی دلیل اور اُن کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔قرآنِ پاک ہدایت کا سرچشمہ ہے۔اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ایک مکمل منشورِ زندگی ہے۔اسلام ہر زمانے میں قابل عمل تھا اور ہر آنے والے دَور میں قابل عمل رہے گا۔

دلیلِ کم نظری ، قصۂ قدیم و جدید ؎

بے شک انبیاء اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانی ہدایت کا ایک مکمل اور پاکیزہ ذریعہ ہیں۔ پہلے پہل معاشرہ سادہ اور ضروریات تھوڑی تھیں گویا انبیاء کا مشن محدود تھا۔ جوں جوں معاشرہ ترقی یافتہ اور مسائل بڑھتے گئے توں توں اُن کا دائرہ کار بھی بڑھتا گیا۔

اسلام کی جامع تعریف یہ ہے:

اللہ پاک کی وحدانیت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت اور ختمِ نبوت کا اعلان اور معاشرے میں سماجی انصاف (Social Justice) کی فراہمی، زبانی بھی اور عملی بھی۔ زبان سے اقرار، دل سے تصدیق اور عمل سے اظہار اسلامی کا حاصل خدا کے نام کی سربلندی، دنیا کی درستی اور خلق کی ہمدردی ہے۔ زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جہاں اسلام یا قرآن بنی نوعِ انسان کے ہر طبقے اور ہر صنفِ انسانی کے لیے رہنما اصول نہ رکھتا ہو۔ اِس لیے حکم ہے کہ ’’پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔‘‘

اسلام کامل تو ہے ہی جمالِ پیہم بھی ہے۔ اللہ پاک نے کمال حکمت سے ہر دور کی ضروریات، مختلف نظام ہائے حیات کی جملہ صفات اسلام میں ایک خاص تناسب سے سمو دی ہیں۔ مثلاً اسلام میں سرمایہ داروں کی بھی رعایت ہے اور سوشلزم کے بعض صالح اجزا بھی پائے جاتے ہیں۔ اسلامی نظامِ سیاست میں جمہوریت (صدارتی ہو یا پارلیمانی) آمریت اور دوسرے ان گنت قسم کے اِزم سب کے سب ایک حکیمانہ تناسب سے پائے جاتے ہیں۔ اسلام تو حکمت کو مومن کی متاعِ گم گشتہ سمجھتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ جہاں سے ملے لے لو۔ یہ اسلام کی جامعیت کا باعث اور کاملیت کا ثبوت ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسلام نہ تو سرمایہ داری ہے، نہ سوشلزم، نہ جمہوریت اور نہ آمریت۔ اسلام صرف اسلام ہی ہے۔ اسلام کا سابقہ لگا کر کوئی اِزم اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ جیسے ہمارے ہاں ایک عرصہ تک اسلامی سوشلزم کی صدائیں سنائی دیتی رہی ہیں۔ اِس موقع پر یہ کہنا بجا ہو گا کہ یہ تو تعلیمِ نبوت کے ایک ورق کی چوری ہے۔

موجودہ دنیا میں باطل کے دو بڑے نظام غالب اور مقابل نظر آتے ہیں۔ ایک سیاسی

جمہوری نظام (Political Democracy)، دوسرا سماجی جمہوری نظام (Social Democracy)۔ ایک سرمایہ دارانہ طرزِ حکومت اور دوسرا عدم طبقاتی سوسائٹی کا دعویدار اِزم۔ دونوں انتہائی افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ پہلے میں فرد آزاد بلکہ بے لگام ہے اور دوسرے میں ریاست مطلق العنان۔ اقبال کے بقول: ’’مغرب کا جمہوری نظام چہرہ روشن، اندرون چنگیز سے تاریک تر، جبکہ اشتراکی کوچہ گرد پریشانِ روزگار، آشفتہ مغز اور آشفتہ مو۔ جبکہ اسلام میں فرد اور جماعت لازم وملزوم ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ فرد کی شخصیت جماعت کی تشکیل میں معاون اور جماعت کا دیا ہوا نظام فرد کی صلاحیتوں کو بنانے میں کارآمد۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

کسی نے کیا خوب کہا ہے: ’’سوسائٹی منتخب افراد کو جنم دے کر بانجھ ہو جاتی ہے۔ یہ منتخب افراد نئی سوسائٹی کو جنم دیتے ہیں۔ اقدار اور روایات معاشرے کے بہترین افراد کے فکر وعمل کے کسر و انکسار کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اسلام فرد اور جماعت دونوں کو یکساں اہمیت دیتا ہے۔ اسلام نے جبر کے نظام کو ختم کیا۔ بادشاہت کی بجائے خلافت کا نظام نافذ کیا، جس میں بندۂ مومن امین ہے اور حق مالک ہے، کا تصوّر رہے۔ خلیفۂ وقت نیل کے کنارے بھوک سے مرنے والے کا خود کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ ہر کوئی راعی ہے اور اُس سے اُس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ اسلام نے ہر قسم کے جبری نظام کو مٹا کر عدل اور مساوات کا نظام جاری کیا ہے۔ ہر کوئی خود احتسابی کے عمل پر کاربند ہے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے محافظ ونگہبان ہیں۔ وہ ایک دوسرے کا لباس ہیں۔ ہر ایک کی ذمہ داری کا خاکہ موجود ہے۔ مردوں کے لیے خدیجہؓ اور عائشہؓ کے شوہر کی زندگی میں کامل نمونہ ہے۔ اگر کوئی باپ ہے تو فاطمہؓ کے باپ اور حسنؓ اور حسینؓ کے نانا کو دیکھے۔ غلام اطاعت شعار ہے تو آقا کو پابند کیا گیا ہے کہ غلاموں کو وہ پہناؤ جیسا خود پہنتے ہو اور ویسا کھلاؤ جیسا خود کھاتے ہو۔ خلیفہ ’’اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ وَ الْفَقْرُ مِنِّی‘‘ کی لگن میں مگن ہے تو گدائے بے نوا خود

داری کی نعمت سے مالا مال ہے۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ حضرت عمرؓ کا غلام کے ساتھ اونٹ پر اپنی باری سے سوار ہونا اور سرورِ عالم کا خندق کھودنے اور مسجد کی تعمیر میں برابر کا شامل ہونا ایسا نظارہ تو چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

جس طرح تمام انبیاء کے خصائل حضورِ اکرم ﷺ کی جامعیتِ کُبریٰ میں جمع ہیں:

حُسنِ یوسفؑ ، دمِ عیسیٰؑ یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

ایسے چار ہزار سالہ انسانی تہذیب کا حُسن جو مسخ نہیں ہوا تھا یا جسے ابدی صداقت کا درجہ حاصل تھا وہ سب اسلام کے دامن میں محفوظ ہے۔ مثال کے طور پر اسلام نے نجی ملکیت کے اصول کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اِس کے تحفّظ کی ضمانت بھی دی ہے۔ ہر ایک کی جان، مال اور آبرو ایسے ہی محترم ہیں جیسے شہر مکہ مکرمہ، یومِ حج اور ماہِ مکرّم ذوالحجہ۔ اسلام طرزِ تفکر میں معاشی مفاد کے تابع نہیں ہے بلکہ معاشی مفاد اِسلام کے تابع ہے۔ اسلام امیر اور غریب میں تفریق، نفرت اور حقارت کی بجائے اخوت اور ہمدردی کا درس دیتا ہے۔

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں اِنساں کے انساں

اصل واقعہ یہ ہے کہ معیشت اور سیاست کے نظام ہر زمانے میں بدلتے رہتے ہیں۔ اگر یہ نظام اسلامی تعلیمات سے متصادم نہ ہوں تو اسلام اِسے رد نہیں کرتا۔ اسلام کسی بیرونی تہذیب سے بَیر نہیں رکھتا۔ ہر خوبی کو اپناتا ہے اور ہر خامی کو رد کر دیتا ہے۔

اسلام کے ذمہ تطہیر کا کام ہے زندگی کے ہر لحظہ میں، عمل کے ہر پہلو میں، فکر کے ہر گوشے اور شعور کے ہر زاویے میں قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ٥ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ٥ کی اِس کتاب (قرآنِ حکیم) میں ہر حکمت، ہر حُسن موجود ہے۔ عبادات ہوں یا معاملات، سائنسی ارتقا ہو یا فلسفیانہ امور، ادب کے سلسلے ہوں یا آداب کے قرینے، سیاست کی رمزیں ہوں یا معیشت کے تقاضے

قرآن ہر رُخِ حیات کے لیے بہترین رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

اسلام نے انقلابی قدم اُٹھایا تھا۔ایک صالح اور پاکیزہ معاشرہ قائم کیا جو بے نظیر تھا اور جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

خود نہ تھے جو راہ پر، اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

وہ صحرائے عرب کے باسی تمدن آفریں اور خلاقِ آئین جہاں داری بن گئے۔اسی دین متین نے نوعِ انسان کو غلامی سے چھڑایا۔کعبے کو جبینوں سے سجایا، باطل کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر اسلام کا بول بالا کیا۔

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سُنایا ہم نے

پھر اقبالؒ نے بھی کہا:

اِس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں ، اللہ کی ہے یہ زمیں

یہی وہ مکمل دین فطرت ہے جس سے طاغوتی طاقتیں خوف زدہ ہیں۔شیطان چیلوں سے کہتا ہے:اس خدا اندیش کی تاریک راتوں کو روشن نہ ہونے دینا۔بقول اقبالؒ:

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد اس کے بدن سے نکال دو

ہر نفس ڈرتا ہوں اِس امت کی بے داری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

مگر افسوس!

لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ

جب سے ہم نے دین کا دامن چھوڑا ہے ذلت اور رسوائی ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ جب تدبیر اُلٹی تو تقدیر کھوٹی والا معاملہ ہے۔ہم شیطانی وسوسوں کے چُنگل میں ہیں:۔ہم اغیار کی غلامی میں جکڑے ہیں۔ بندۂ مومن کا دین سرمایہ داری بن گیا ہے۔وہ اسلام جس نے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف کیا تھا،منعموں کو مال و دولت کا امین بنایا تھا ایسا نہیں رہا۔ یہ اُمّت حامل قرآن نہیں رہی۔ پھر بھی ابھی دیر نہیں ہوئی۔شیطان اپنے مشیروں سے کہہ رہا ہے:

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اِس اُمّت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اِس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

اب بھی شبِ غم سحر آشنا ہو سکتی ہے،بشرطیکہ میدانِ عمل میں اُتریں۔ یک جہتی کی فضا پیدا کریں۔

سفر ہے شرط ، مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

☆☆☆☆☆☆

جدید راہوں کا شاعر

"کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور" یہ مصرع مقطع کا مصرعۂ ثانی ہے۔ بے شک غالب کو اپنے خاندانی شرف ونجابت پر بڑا ناز تھا۔ ایسے اُنھیں اپنی شاعرانہ عظمت کا احساس بھی بھر پور ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اُنھیں احساس ہے کہ اُن کا فارسی دیوان "شہرتِ پروین بودے۔"

گنجینۂ معنی کا طلسم اِس کو سمجھیئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

اس طرح کا مفہوم رکھنے والے کئی اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں۔ یہ دعویٰ بظاہر حیرت انگیز سہی لیکن بے دلیل نہیں ہے۔ غالب صرف عظیم شاعر ہی نہیں بلکہ عظیم نثر نگار بھی ہیں۔ اُنھوں نے اُردو شاعری اور نثر دونوں کو متاثر کیا ہے۔ اُردو نثر میں غالب کی یادگار صرف اُن کے مکتوبات ہیں۔ لیکن یہ مکتوب نہیں بلکہ ادب کا لازوال سرمایہ ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے اُن کی دین اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ اپنے عہد میں اُنھوں نے تنہا یہ آواز بلند کی کہ شاعری قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی ہے۔ مجذوب کی بڑ نہیں۔ مطلب ومقصد رسے ہم آہنگی ہے۔ لڑکوں کا کھیل نہیں، دیدۂ بینا کی کسوٹی ہے۔ حمزہ کا قصہ نہیں، قطرہ میں دجلہ کی نمائش ہے۔ قد وگیسو کی آرائش نہیں، دار ورسن کی آزمائش ہے۔ بادہ وساغر کا تذکرہ نہیں، مشاہدۂ حق کی گفتگو ہے۔ ایسے اُردو شاعری عمومًا اور اُردو غزل خصوصاً ایک نئے جہانِ معنی سے آشنا ہوئی۔

کہتے ہیں غالب، مومن، ذوق، اور ظفر، ولی دکنی کی بزم کی آخری شمعیں ہیں لیکن ناقدین

کی رائے میں غالب تک آتے آتے غزل کے دو دھارے ہو چکے تھے۔غالب نے غزل کے نسب کو ولی سے نکال کر رودکی تک پہنچا دیا ہے۔مروجہ اُردو دیوان کا پہلا شعر:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

"نقش فریادی" اور "کاغذی پیرہن" کی تراکیب فارسی زبان اور ملک ایران میں تو ہوں تو ہوں مگر اُردو غزل اور ہندوستان کے شعراء میں نایاب تھیں۔شعر کے معنی تو سمجھ میں آئیں نہ آئیں، اس کی شیریں بیانی اور لطافت مزہ ضرور دیتی ہے۔ٹالسٹائی کا قول اس پر صادق آتا ہے کہ:"آفاقی ادب کی تخلیق کا راز کسی لطیف احساس کو دل کش اسلوب عطا کر دینے میں پوشیدہ ہے۔حقائق و مظاہر و مناظر تو یقینا ایک سے ہی ہوتے ہیں لیکن اس کے بیان و اظہار کی ادائیں جدا جدا ہوتی ہیں۔ڈاکٹر یوسف حسین کا فرمان بجا:

"شاعر جو کچھ کہتا ہے بلاشبہ اہم ہے لیکن اس سے زیادہ ہم یہ ہے کہ وہ اپنی بات کس طرح کہتا ہے۔" آلِ احمد سرور لکھتے ہیں:"فن میں چونکہ سارا کھیل کہنے کا ہے، اِس لیے ہمیں غالب کی شاعری کی خصوصیات کو اِس ذیل میں پرکھنا چاہیے۔"غالب کے قصرِ شاعری کی بنیاد ندرتِ فکر، جدتِ اظہار اور بیان کی قدرت پر ہے۔کسی نے کیا خوب کہا تھا کہ:"غالب کی جدت کا یہ عالم ہے کہ وہ کسی اور کے راستے پر چلنا تو ایک طرف، وہ تو وبائے عام میں مرنا بھی نہیں چاہتا۔"مولانا حالی نے اسی جدت پسندی کو اوریجنلیٹی (Originality) کا نام دیا ہے۔پروفیسر رشید احمد صدیقی کے بقول:"غالب نے اُردو شاعری کو ایک نیا افق، نیا نسب اور نیا شعور عطا کیا ہے۔" آگے لکھتے ہیں:" غالب نے اُردو شاعری کو ایک نیا نسب ہی نہیں دیا بلکہ ایک نئی شریعت کی بشارت بھی دی ہے۔" غالب اُردو شاعری کی تنہا آواز ہیں۔اُن کے فن میں اُردو تاریخِ شعر کے سب دھارے یعنی جذبات نگاری، خیال آرائی اور صنعت گری یکجا ہو جاتے ہیں۔اُن کے ہاں فکر و فن یا فلسفہ و جذبہ باہم بغل گیر ہیں۔اُن کی سادگی اور بے ساختگی سے کہی ہوئی بات شاعری کے پرکھنے کا فارمولا بن

جاتی ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یہ تمام باتیں اُن کی غزل اور دیوان کے بارے میں نہیں بلکہ اُن کے خطوط میں بھی وہی بے ساختگی، سادگی اور لطافت موجود ہے۔ٹھیک ہے کہ غالب نے شاعری کا آغاز بہت کم عمری میں کیا۔(۷۔۱۸۰۵ء) میں اُن کی ندرت اور غرابت کو دیکھ کر میر تقی میر نے کہا تھا: ’’اگر اِس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اس نے اسے سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔‘‘

ضیاء الدین احمد خان کی ’’تقریظ‘‘، سر سیّد احمد خان کی ’’آثار الصنادید‘‘، خوب چند ذکا، اعظم الدولہ سرور اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے تذکروں میں غالب کا ذکر مع انتخابِ کلام ملتا ہے۔ مگر اُس عہد میں غالب کی وہ حق شناسی نہیں ہوئی جو اس کا حق تھا۔غالباً غالب کی مشکل پسندی اور طرزِ بیدل، شوکت و امیر کی اسیری سنگِ راہ ہوئی ہوگی۔

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسداللہ خاں قیامت ہے

کہہ کر تائب ہوئے اور اپنی اصلی اور سچی راہ بنائی۔عدمِ قبولیت کی دیگر وجوہات بھی ہوں گی اور یقیناً ہیں۔غالب کے عہد میں اُنھیں شاعر تو مانتے تھے مگر بڑا شاعر نہیں۔اس زمانے میں دربار میں ذوق کو اور دولت میں مومن خان مومن کو فضیلت حاصل تھی۔اُن کی وفات کے بعد مولانا حالی نے ’’یادگارِ غالب‘‘ اور ڈاکٹر عبدالرحمن نے ’’محاسن کلامِ غالب‘‘ لکھی۔پھر اُن کی شہرت کی مہک آفاق میں پھیل گئی۔بلکہ پروفیسر ارشاد کا کہنا بجا کہ جب علامہ اقبالؒ نے شاعری کے خصوصاً نئے معیار قائم کیے، اُن پر رکھ کر غالب کو پرکھا تو غالب بڑا شاعر نکل آیا۔اِتنا بڑا کہ ذوق اور مومن اس کی شہرت میں دم بخود ہو گئے۔

اقبالؒ نے اپنی نظم میں غالب کی عظمت کا اعتراف بھی کیا ہے:

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریّا رفعتِ پرواز پر
فکرِ اِنساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رسائی تا کجا

غالب کی شاعری وہبی ہے اکتسابی نہیں۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

ڈاکٹر سیّد معین الرحمن کی صائب رائے ہے: ''خدا کی طرف سے اُنھیں وافر نورِ خرد عطا ہوا اور گنجِ سخن سے مالا مال کیا گیا''۔ غالب ہمیشہ زندگی، زمانے اور ذہن سے ستیزہ کار رہا ہے۔ وہ آبلہ پائی سے گھبراتے نہیں بلکہ راہ کو پُر خار دیکھ کر اُن کا جی خوش ہوتا ہے۔ اُن کے ہاں رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے۔ رنج...... کا معاملہ ہے۔ غمِ عشق کے ساتھ غمِ روزگار کی ترکیب بھی اُن کے ہاں پہلی مرتبہ اُردو شاعری میں استعمال ہوئی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ فلسفۂ زندگی حقیقت سے کس قدر قریب اور درست ہے:

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

یا پھر:

یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

یہ درست کہ اُنھیں روزہ سے زیادہ روزی کی فکر ہے۔ مگر حاجت جو شیروں کو روباہ بنا دیتی ہے۔ غالب کو حاجت نے شیر بنا دیا ہے۔ اُن کے ہاں غم گھُٹن بن کر آنکھوں سے نہیں ٹپکتا بلکہ

مسکراہٹ کی صورت لبوں پر پھیل جاتا ہے۔ اُنھوں نے نظم ونثر خصوصاً غزل کو دل کش، فکر انگیز، اچھوتا، تہہ دار اور پُر کار و پُر وقار لہجہ دیا ہے بلکہ بے مثل لب ولہجہ عطا کیا ہے۔ غالب کی سادگی و پُر کاری، حقائق کی منظر کشی اور نظریہ وحدت الوجود کے بیان کی قدرت کو دیکھنے کے لیے درج ذیل اشعار کا حوالہ مناسب رہے گا:

☆ تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

☆ قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

☆ دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر — ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

☆ اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

☆ ہے مشتمل نمود صور پر وجودِ بحر — یاں کیا دھرا ہے قطرۂ موج و حباب میں

☆ ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

☆ دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں

☆ نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

☆ ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

خدائے پاک کی احدیت کے بعد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان کا بیان ملاحظہ ہو:

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم — کہ آں ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

ایک خط میں محبت کا اظہار اِن الفاظ میں کیا ہے: ''لفظ م ح م د (محمدؐ) کے ہر ہر حرف پر میری جان بھی قربان ہے۔'' ثنائے خواجہؐ کے بعد اہلِ بیت سے محبت کا اظہار بھی نرالا اور دل نشین ہے:

غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست — مشغولِ حق ہوں بندگیِ بُوترابؓ میں

مثنوی دعائے صباح حضرت علیؑ سے منسوب دعا کا منظوم فارسی ترجمہ ہے جس کے ۲۲

اشعار ہیں اور مزید سات اشعار جو امام زین العابدینؑ سے منسوب ہیں کا منظوم فارسی ترجمہ جسے سجدہ کی حالت میں پڑھنا چاہیے۔ ایسے اہلِ بیت سے عقیدت کے اظہار کا اپنا رنگ ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا قول: ''فلسفہ جدلیات اور کرشمہ اضداد اور زندگی و ادب کے رشتوں کے متعلق ہیگل اور میتھیو آرنلڈ سے لے کر علامہ اقبال اور مجنوں گھورکھپوری تک پڑھنے کو تو کیا کچھ نہ پڑھا تھا لیکن ذہن سے بڑھ کر دل میں بات اُس وقت اُتری جب غالب کے اِس نوع کے شعر سامنے آئے:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا — بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی — ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

غالب کا عہد قدیم و جدید کی آویزش کا عہد تھا۔ پرانی اقدار کی جگہ نئی اقدار راہ پا رہی تھیں۔ غالب نے بقول پروفیسر عبدالودود سمجھ لیا تھا کہ پرانا سماج اب چند روزہ ہے۔ نیا سماج پرانے سماج کی کوکھ سے اُبھر رہا ہے۔ وہ نشاطِ تصور کی گرمی سے نغمہ سنج ہیں۔ اُنھوں نے اُردو کو نئی زندگی دی ہے۔ اِس طرح اُنھیں پہلا ترقی پسند شاعر ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔ وہ اقبالؒ کی طرح یہ تو نہیں کہتے:

آئین نَو سے ڈرنا، طرزِ کُہن پہ اڑنا — منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

مگر یوں ضرور کہتے ہیں:

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

رقیب کی رقابت اور عدو کی مخالفت کا ذکر تو اُردو شاعری میں جا بجا ملتا ہے، مگر غالب کے ہاں اس کا اظہار اپنے رنگ میں ہے:

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں — عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ — ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

اُردو نظم ونثر میں طنز ومزاح کی مختلف صورتیں تو موجود رہی ہیں اور رہیں گی بھی۔ مگر کلامِ غالب اور خطوطِ غالب میں اِس کے نادر نمونے اُن کی ظرافتِ طبع اور متانت آمیز ظرافت کا پتا دیتے ہیں۔ مولانا حالی کا کہنا درست ہے کہ ''مرزا غالب کو حیوانِ ناطق کی بجائے حیوانِ ظریف کہا جانا چاہیے۔''

اب نظم ونثر میں اِن مثالوں سے حظ اُٹھائیں۔ ''کسی کی موت پر وہ روئے جسے خود نہ مرنا ہو۔'' بیوی کو بیڑی اور بچوں کو ہتھکڑیاں کہنا صرف غالب کے ہاں ہی ملتا ہے۔ مصائبِ زندگی کو کیسے بیان کرتے ہیں۔ ''عالم آب وگل کے گنہگار عالم ارواح میں سزا پائیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم سے عالم ارواح میں جو غلطیاں ہوئیں، سزا دینے کے لیے عالم آب وگل میں بھیجا گیا۔'' علاؤ الدین خان علائی کو لکھتے ہیں: ''میاں، تمھارے دادا میاں امین الدین خان بہادر ہیں۔ میں تو تمھارا دلدادہ ہوں۔'' مرزا حاتم بیگ کو مبارک باد کہتے ہوئے لکھتے ہیں: ''صاحب میرے، عہدۂ وکالت مبارک ہو۔ مؤکلوں سے کام لیا کیجئے۔ پریوں کو تسخیر کیا کیجئے۔'' اب ذرا شعر کی دنیا میں طنز ومزاح اور ظرافت کی بہار دیکھیے:

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ سرگشتۂ خمار رسوم وقیود تھا

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر! نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

متانت آمیز ظرافت کا یہ سلسلہ اور اندازِ بیان کا یہ قرینہ تا دمِ مرگ باقی رہا۔ وفات سے ایک آدھ روز قبل بقول مولانا حالی: بے ہوشی سے دیر بعد افاقہ ہوا۔ علاؤ الدین علائی کے خط کا

جواب ایک فقرہ میں لکھوایا اور ایک فارسی شعر، شاید سعدی شیرازی کا تھا۔ ''میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔'' فارسی شعر نہیں ملا مگر دمِ واپسیں یہ شعر بار بار زبان پر جاری تھا:

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

محاکماتِ شعری اور تخیّل کی گُل کاری و رسائی، زندگی کی گہما گہمی، انسانی زندگی کے نفسیاتی پہلوؤں کا نقشہ، درازیِ عمر کی تمنا، دولت و سرمایہ کے جبر و استبداد کا تذکرہ، رجائیت و قنوطیت کا توازن، ایجاز و اختصار و معنی آفرینی، صنعتِ جمع، صنعتِ عکس، صنعتِ مراۃ النظیر، سہل ممتنع، صنعتِ استفہام و استدلال کے ذریعے حُسنِ بیان کا نگارخانہ ہے جس سے ہر قاری اپنے اپنے فکر اور ظرف کے مطابق بہرہ ور ہوسکتا ہے۔ آئیں دیکھتے ہیں:

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
تیری زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

☆ خوں ہو کے جگر، آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ — رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے
☆ غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر — کیوں شاہدِ گُل باغ سے بازار میں آوے
☆ قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
☆ کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل — انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
☆ بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
گو ہاتھ میں جُنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
☆ دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
☆ زندگی اپنی جب اِس شکل سے گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
☆ بوئے گُل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

☆ اِبنِ مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
☆ اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

کلامِ غالب میں لوحِ جہاں، ویرانی سی ویرانی، حرفِ مکرّر، گرمیِ بزم، رقصِ شرر، فرصتِ ہستی، حلقۂ دامِ خیال، بالائے جان، روزِ ابر، شبِ مہتاب، دمِ عیسیٰ، غمِ ہستی، دلِ شوریدہ، قیدِ حیات و بندِ غم، شورِ پندِ ناصح، وفورِ اشک، آتش زیرِ پا، دل گداختہ، مکاں کو ہے مکیں سے شرف، دیوار و در کا در و دیوار ہونا، ایسی تراکیب اور مرکبات کا اپنا رنگ ہے۔ یہ ملکہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اُنھوں نے ٹھیک ہی کہا ہے:

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

اب نمونے کے چند اور اشعار:

☆ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اِس درد کی دوا کیا ہے
☆ درد منت کشِ دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا
☆ آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی
☆ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
☆ تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
☆ دَیر نہیں، حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں
☆ اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے
☆ بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
☆ کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ پر اِتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

غالب شاعرِ امروز و فردا ہیں۔ اُن کے دس ہزار سے زیادہ فارسی اشعار اور 64 قصائد ہیں۔ جب کہ اُردو کے 11 قصائد ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر اُن کا اُردو دیوان اور خطوط ہیں جن کی

تعداد سینکڑوں میں ہے۔غالب نے اپنے اُردو دِیوان کو بے رنگ کہا ہے۔مگر اِس میں مسائل زندگی، اسرارِحیات اور مسائل تصوّف کا ہر رنگ موجود ہے۔اِس بنا پر محمد مردان علی رعنا شاگردِ غالب نے اُنھیں خاتم الشعراء کہا ہے۔پھر عبدالرّحمن بجنوری کا کہنا:''کون سا نغمہ ہے جو اِس زندگی کے تاروں میں بے دار یا خوابیدہ نہیں۔''ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کہا تھا:''غالب کے ہاں قدم قدم پر گُل وگلزار سے کھلتے ہیں، غُنچے سے چٹکتے اور کلیاں سی مسکراتی ہیں۔دور اُفق پر شفق کا منظر اور ایوانوں میں شبستانوں کی بہار دِکھائی دیتی ہے۔''

غالب پر آج تک بہت وقیع اور وسیع کام ہو چکا ہے۔بہت سے ماہرین غالبیات کا ذکر ہو چکا ہے۔شریمتی مایا گُپت نے کہا:''غالب میں اُن کا اپنا پن تھا۔ہنسی مذاق کا لطیف و نازک جذبہ، پریم اور محبت کے گیت گانے والا، درد میں ڈوبا ہوا دل رکھنے والا شاعر۔''غالب کے ہاں اس کا اظہار دیکھیے:

قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

ڈاکٹر مالک رام سے لے کر شیخ اِکرام تک، ڈاکٹر عبدالسّتار صدیقی سے لے کر مختار الدین احمد تک، مولوی مہیش پرشاد سے شروع ہو کر مولانا غلام رسول مہر اور حسرت موہانی تک۔ مولانا امتیاز علی عرشی سے لے کر عبدالباری آسی تک، سیّد وقار عظیم (غالب پر نفس مطمئنّہ رکھنے والے) سے لے کر ڈاکٹر سیّد معین الرحمن (اشاریہ غالب والے) تک اِتنا کچھ لکھا اور پڑھا گیا کہ اس کا احاطہ ایک مضمون میں ممکن نہیں۔لیکن اِتنا ضرور ہے کہ اُنھوں نے غالب کو متعارف کروایا اور اپنے سر غالب اور غالبیات کا تاج سجایا۔

بڑا معروف مصرع ہے کہ''سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا۔'' کہتے ہیں کہ عقیق کے کٹنے سے اس پر مختلف سطحیں بنتی ہیں۔جب سورج کی شعاعیں اس کی مختلف سطوح پر پڑتی ہے تو ہر سطح سے کئی کئی رنگ پھوٹ کر فضا میں بکھر جاتے ہیں۔ایسے ہی مرزا اسداللہ خاں غالب دبیرالملک نظام

جنگ نے شاعری ونثر کے عقیق کو ایسا تراشا کہ جب اہلِ علم کی علمی شعاعیں اس نگیں پر پڑیں تو اس میں سے رنگ رنگ کے جلوے پھوٹے جس پر سحر کاری کا گمان ہونے لگا۔فیض احمد فیض کا کہنا بجا: زندگی کے سب تیور بیان کر ڈالے پسماندگان کے لیے کچھ نہ چھوڑا۔'' آخر میں مزید چند اشعار پیشِ خدمت ہیں،خوب مزا رہے گا:۔

☆ نقشِ معنی ہمہ خمیازہ عرضِ صورت سخن حق ذوقِ پیمانۂ تحسین

☆ مظہرِ فیضِ خدا جان و دل ختم الرّسلؐ قبلۂ آلِ نبیؐ،کعبہ ایجاد و یقین

☆ آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غالب گرمیِ بزم ہے اِک رقصِ شرر ہونے تک

☆ جان دی ، دی ہوئی اُسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

☆ وفاداری بشرطِ اُستواری اصل ایماں ہے مَرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

☆ اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

☆ ہر چند کہ ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

غالب کی رفعتِ تخیّل،فکری عمق اور جذبے کی صداقت اپنا شوخ رنگ رکھتی ہے۔مگر کبھی کبھی فکر اتنی عمیق ہوتی ہے کہ اس پر دقیق ہونے کا احساس بھی ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

بلاعنوان

سوچوں کی دنیا میں گم .... تمام مذہبی تقریبات، عید ہو یا عاشورہ ....
پولیس کی نگرانی، رینجرز کی پاسبانی، فوج کی استعانت، ہیلی کاپٹر کے ساتھ فضائی نگہبانی، موٹر سائیکل کبھی ڈبل سواری اور کبھی سنگل سواری پر بھی پابندی، موبائل فون کی بندش کے احکامات سے اختتام پذیر ہوتی ہیں۔ پھر بھی ''سب خیر''، ''سب کی خیر'' کی خبر سُننے کو کان ترس گئے ہیں۔ ''بھلا کر، بھلا ہوگا'' کی صدا لگانے والے درویش زیرِ زمین ہیں یا گوشہ گیر ہیں۔ پاکستان بننے اور ہجرت کی باتیں بزرگوں سے سُن رکھی ہیں۔ وہ ان خالص جذبوں کے ساتھ وطن عزیز میں آئے تھے جہاں سب اپنے ہوں گے۔ امن وآشتی اور بھلائی اور خیر خواہی کے روح پرور مناظر ہوں گے۔ خون کا دریا عبور کر کے آنے والوں کے حوصلے پست نہیں تھے۔ اُن کے چہرے سرخرو، امنگیں بے تاب، ولولے جواں اور عزائم بے دار تھے۔ سب کے سینے کینے سے پاک ''چشمِ ماروشن دلِ ماشاد'' کے ساتھ وطن پاک کی مانگ خالص جذبوں سے سنوارنے آئے تھے۔ اُنھوں نے ایسے وطن کے خواب دیکھے تھے جہاں ہر قسم کی مذہبی آزادی ہوگی۔ مسلم تو ایک طرف وہاں تو غیر مسلم بھی مکمل تحفّظ اور آزادی کے ساتھ اپنی عبادات ادا اور امن سے اپنی زندگی بسر کرسکیں گے۔ جہاں قانون کی حکمرانی اور میرٹ کی بالادستی ہوگی۔ دولت کی مساوی تقسیم اور تعلیم کے یکساں مواقع ہوں گے۔ امیر اور غریب، ادنیٰ اور اعلیٰ، شیعہ اور سُنّی باہم شیر وشکر ہوں گے۔ سب کے دکھ سانجھے اور سب کی خوشیاں مشترک ہوں گی۔ بہترین معاشرے کا نام اُمت ہے۔ سب کا ایمان ایک اور ہدف مشترک ہوگا۔

جب پاکستان بن گیا۔ مہاجرین کو مسلم غیر مہاجرین حسرت اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ خدیجہ مستور کے ''آنگن'' سے چند سطور اُس جذبے اور آرزو کی عکاس ہیں۔ چھمی اپنی چچا زاد سے کہتی ہیں:

''عالیہ! تجھے پاکستان جانا مبارک ہو۔ میں بدنصیب تو وہاں جا بھی نہیں سکتی۔ میری طرف سے پاک سرزمین کو چومیے گا اور وہاں کی مٹی مجھے بھیجیئے گا۔ میں اُسے اپنی مانگ میں لگاؤں گی۔''

لیکن یہاں آتے ہی سب کچھ بدلنے لگا۔ سوچ، زندگی، نظریں۔ صورتیں سایوں میں ڈھل گئی ہیں۔ سائے اندھیرے میں ڈوب گئے۔ بہت اچھے آدمی بھی اچھے نہ رہے۔ بقول شاعر:

وقت نے نوچے ہیں کیسے کیسے چہروں سے نقاب
راہ زن نکلا تھا جو تھا رہنما ٹھہرا ہوا

عوامی احساسات اور حکومتی تعبیرات جُدا جُدا ہیں۔ اہلِ اقتدار کو غصہ ہے کہ ہماری فتوحات کا تذکرہ کیوں نہیں؟ عوام کو شکایات کہ ہمارے دکھوں اور مسائل کا مداوا کیوں نہیں؟ عدم اعتماد کی خلیج بڑھتی جا رہی ہے۔ حکومت اپنے انتظامات اور ترقیات پر نازاں اور عوام ڈرے ڈرے، سہمے سہمے، ان جانے خوف اور بے یقینی کے بڑھتے ہوئے سایوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کراچی کے حوادث کی خونیں خبریں، کوئٹہ کی لہو رنگ فضا، شمالی اور جنوبی وزیرستان کی دل دوز کہانیاں۔ چلتے بم، گرتی لاشیں، کٹتے سر، پرخچے اُڑتے جسم، چکنا چور شیشے، تباہ ہوتی عمارات، زخمی اور زیرِ علاج ملالہ (جو فروغِ علم کے یا حصولِ علم کے شوق میں) بیرونِ ملک ہے۔ یہ حالات اور واقعات، یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر آخر کیا نقشہ پیش کرتی ہے؟

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

عوام کا مؤقف درست معلوم ہوتا ہے۔ ملک میں دولت کا سیلاب، اہلِ ثروت کی زیبائش، آرائش، آسائشات بے پناہ ہیں۔ اہلِ اقتدار کا پروٹوکول بیس سے تیس تیس گاڑیاں، سرکاری اخراجات بے شمار۔ اور شمار سے بڑھ کر، بیرونِ ملک دولت کے انبار، مہنگے سوٹ، بیرونِ ملک علاج:

تمھاری باندیاں بھی ریشمی تھانوں میں تلتی ہیں
ہماری بیٹیوں کے تن کی عُریانی نہیں جاتی

چلو انتظامات کا دیکھ لیتے ہیں ۔عوام سوال کرتے ہیں کہ ریل کہاں غائب؟ ہوائی سروس میں بدنظمی کا باعث کون؟ بجلی کے بحران کے کیا معنی؟ سوئی گیس کی راشن بندی کیسی؟ سرمایہ دار اور سرمایہ کاری دیگر ممالک میں سرمایہ کاری کے معنی کیا ہیں؟ ایٹمی طاقت اور وسائل کی فراوانی .... عوامی مسائل .... عوامی مراعات کی محرومی آخرکس کے حُسنِ کرشمہ ساز کی ساز باز ہے؟ دو فیصد خواص کا 98 فی صد عوام سے یہ سوتیلا سلوک کیسا؟

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

روز بروز بڑھتی مہنگائی سے لے کر گھٹتا ہوا روپیہ اور بڑھتا ہوا ڈالر۔ جب بچوں کو، طلباء کو بتاتے ہیں کہ بھئی! 1965ء کی جنگ سے پہلے ایک گائے 265 روپے میں خرید کر ہم اپنی جگہ خوش تھے اور بیوپاری اپنی جگہ راضی کہ اُس نے پورے 35 روپے منافع کمایا ہے۔ اُدھار خریدی چیزیں اتنے ہی مہنگے داموں بکتی تھیں۔ قصہ سُن کر طلبہ ایسے منہ دیکھتے ہیں جیسے کوئی الف لیلوی کہانی سُن رہے ہوں۔ کیونکہ اِتنی رقم میں اُنھیں برگر بھی نہیں ملتا۔ آخر فقیروں کی لُٹتی کمائی دیکھ کر عہد کے سلطان کی بھول کا تذکرہ کیے بغیر چارہ نہیں۔

یہ سب کیسے ہوا؟ ایک درویش بے نوا صدا لگا رہا تھا:

جی اُٹھی ہیں خواہشیں اور مرگیا ہے آدمی

لیکن مایوسی اور نا امیدی کفر ہے۔ لَاتَقْنَطُوْا کی صدا ہر صاحب دل کو سُنائی دے رہی ہے۔

قعرِ دریا میں بھی آ نکلے گی سورج کی کرن
مجھ کو آتا نہیں محرومِ تمنّا ہونا

علاج کیسے؟ بے شمار جوابات ذہن کے گوشے سے اُبھرتے ہیں۔

یکساں نظامِ تعلیم۔ قانون کی بالا دستی۔ تعصبات سے پاک معاشرہ۔ فکری و عملی وحدت۔ ووٹ کا درست استعمال۔ فرقہ واریت کا خاتمہ۔ اسلام کی آفاقی، ابدی اور عالم گیر

تعلیمات سے روشنی حاصل کرنا۔

چونکہ ہر فرد ملت کے مقدّر کا ستارہ ہے اور قومی ترقی شخصی محنت، شخصی ایمان داری، شخصی عزت، اور شخصی ہمدردی کا مجموعہ ہے تو عوام کو اپنی اور قومی تقدیر سازی کے لیے آگے بڑھنا ہوگا۔ اِن حالات میں ووٹ کے درست استعمال ہی سے قوم کی تقدیر وابستہ ہے۔ پھر شکایت کی گنجائش کم اور بے فائدہ ہوگی۔ فرمانِ خداوندی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳:۱۱) خدا بھی اُن اقوام کی حالت بدلتا ہے جو اپنی حالت خود بدلنے کے لیے کوشش کرتی ہیں۔

باب چہارم

خطوط، آپ بیتی اور مکالمے

نمبر شمار	فہرست عنوانات	صفحہ نمبر
(الف)	کچھ خطوط کے بارے میں	205
1	تعزیت نامہ (دوست کی والدہ کی وفات پر)	206
2	تاریخی مقام کی سیر (احوال و تاثرات)	208
3	دوست کی شادی میں عدم شرکت پر معذرت نامہ	210
4	ورزش کی افادیت	212
5	ڈپٹی کمشنر کے نام (سٹریٹ کرائم کے خاتمے کے لیے)	213
6	حادثات کی روک تھام	214
7	ہم نصابی سرگرمیوں کی افادیت	216
8	ملاوٹ کی لعنت	217
9	مہنگائی کے مسائل	218
10	نظامِ تعلیم کی خامیاں	220
11	منشیات کا بڑھتا رُجحان	222
12	گلاب کی آپ بیتی	223
(ب)	مختصر مکالمے	225

باب چہارم

(الف) کچھ خطوط کے بارے میں

خط ایک طرح کی تحریری گفتگو ہے جس کے ذریعے ہم اپنے اپنے حالات سے ایک دوسرے کو آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے خط کو نصف ملاقات کہتے ہیں۔ غالب کا دعویٰ ہے کہ اُنھوں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ خط نجی ہو یا کاروباری، رسمی ہو یا سرکاری ہر چند خط لکھنے کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔ لیکن بالعموم مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھنے سے ذوقِ سخن اور مذاق کا پتا چلتا ہے۔

(الف) خط کی پیشانی کے دائیں جانب مقامِ روانگی (امتحانی مرکز) اور اُس کے نیچے تاریخ لکھی جاتی ہے۔ تاریخ اُردو اور انگریزی اعداد دونوں صورتوں میں کسی بھی ایک صورت میں لکھی جا سکتی ہے

(ب) صفحے کے وسط میں طرزِ تخاطب اور بلحاظ بزرگی یا خوردی (چھوٹے، بڑے) مختصر القاب و آداب لکھے جاتے ہیں۔

(ج) خط مختصر ہونا چاہیے نا کہ اپنا اور دوسرے کا وقت ضائع نہ ہو۔ مختصر لکھنا مشکل بھی ہوتا ہے یعنی دقیق بھی اور دقت طلب بھی۔ سُنا تھا کہ ایک دوست نے دوسرے دوست کو چھ صفحات پر مشتمل خط لکھ دیا اور ساتھ لکھا کہ میں نے اِتنا طویل خط اِس لیے لکھا ہے کہ میرے پاس مختصر خط لکھنے کا وقت نہیں تھا۔

(د) جملے چھوٹے چھوٹے اور واضح ہوں کیوں کہ لمبے جملے اُلجھن کا باعث ہوتے ہیں۔

(ہ) خط کے نفسِ مضمون کے بعد قدرے بائیں جانب لکھنے والے کا نام اور پتا لکھا جاتا ہے۔

نوٹ: امتحان میں فرضی نام اور پتا لکھنا چاہیے۔ (ا۔ب۔ج وغیرہ۔ نمونے کے خطوط پیشِ خدمت ہیں:

تعزیت نامہ

والدہ کی وفات پر خط

امتحانی مرکز

یکم دسمبر 2022ء

بھائی احمد!

السلام علیکم!

آپ کی والدہ ماجدہ کے انتقال کی خبر سُن کر مجھے اور میرے اہلِ خانہ کو بہت زیادہ صدمہ ہوا۔ یہ سانحہ آپ کے لیے تو کسی قیامت سے کم نہ ہوگا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

احمد صاحب! دنیا میں ماں کے سِوا کوئی خالص اور بے لوث رِشتہ نہیں ہوتا۔ اُن کی محبت بے ریا، بے بدل اور بے غرض ہوتی ہے۔ باپ کفالت کرتا ہے اور ماں پرورش۔ پرورش کی بنیاد پر ہی اللہ تعالیٰ نے جنت ماں کے قدموں تلے رکھی ہے۔ کسی نے کیا خوب نکتہ بیان کیا ہے کہ ”محبت تو کئی مقامات اور کئی رِشتوں سے مل سکتی ہے اور ممتا صرف ماں ہی سے وابستہ ہے۔ ...... مگر بھائی موت ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے جس سے کسی شخص کو مفر نہیں۔

کتنی مشکل زندگی ہے، کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیمِ ارزاں ہے موت

قانونِ قدرت کے آگے ہر کوئی بے بس ہے۔ یہاں تو سانس کی آری ہر لمحہ ہستی

کے شجر کاٹ رہی ہے۔موت کے سامنے ہر کوئی بے بس اور بے کس ہے۔جب سرِ مجبوری آنکھوں پر عیاں ہو جائے تو آنسوؤں کا سیل رواں تھم جاتا ہے۔

جناب! بے شک مرحومہ کی زندگی ہمارے لیے محبت کا پیکر، ایشار کا نمونہ اور خاندان میں وحدت کا ذریعہ تھی۔تمام رِشتہ داراُن کے حُسنِ سلوک کے مداح ہیں۔زندگی کا مقصد بھی یہی ہے کہ مخلوقِ خدا کسی بندۂ خدا پر راضی ہو جائے۔

آخر میں میری اور میرے اہلِ خانہ کی دعا ہے کہ ربّ کائنات اُنھیں سکون اور راحت عطا کرے۔اُنھیں جنت الفردوس میں بلند مقام نصیب ہو اور آپ کو اور تمام پس ماندگان کو لمحہ صبر اور اجر عطا فرمائے۔(آمین)

والسلام

آپ کا مخلص

رول نمبر ....

☆☆☆☆☆☆

تاریخی مقام کی سیر

تاثرات اور احوال

امتحانی مرکز

یکم دسمبر 2013ء

پیارے احمد!

السّلامُ علیکم!

آپ جانتے ہیں کہ مشاہدہ انسان کو باخبر اور اس کے علم کو تقویت دیتا ہے۔ میں بھی پچھلے ہفتے لاہور کے تاریخی مقامات دیکھنے کے لیے گیا تھا۔ میں تمام معلومات اور مناظر آپ سے شیئر (Share) کر رہا ہوں۔ سیر و سیاحت تعلیم بھی اور تفریح بھی کہلاتی ہے۔ اگرچہ میں لاہور کی تمام عمارات تو نہ دیکھ سکا اور ایک دن میں اُن کا دیکھنا ممکن بھی نہ تھا۔ جب میں ویگن سے اُترا تو سامنے ایک کھلے سبزہ زار میں ''مینارِ پاکستان'' پر نظر پڑی۔ یہ مینار منٹو پارک میں تعمیر کیا گیا۔ جو مسلم لیگ کے ستائیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ 23 مارچ 1940ء کی یاد تازہ کرتا ہے۔ جہاں تمام اسلامیانِ ہند نے مراعات اور تحفظات کی بجائے اپنے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کی تعمیر 1968ء میں شروع ہوئی اور تعمیر 1973ء میں مکمل ہوئی۔ اسے بدنصیبی کہیں یا بے تدبیری کہ مینارِ پاکستان کی تعمیر مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ پاکستان دولخت ہو گیا۔ وہ پاکستان جو قائدِاعظم کے چودہ نکات کی روشنی میں حاصل کیا تھا مجیب الرّحمن کے چھ نکات کی تاریکی میں دولخت ہوا۔

عجیب اتفاق ہے کہ مینارِ پاکستان کے چاروں طرف تاریخی عمارات پھیلی ہوئی ہیں۔ اِس مینار کے سامنے بادشاہی مسجد کے چاروں مینار مغلیہ خاندان کی عظمت اور اسلام دوستی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس مسجد کی دیوار کے سائے میں علامہ اقبال کی خواب گاہ ہے جس پر ہر صبح عالمگیر کے تعمیر کیے ہوئے مینار اپنی سنگِ سرخ میں لپٹی ہوئی پُر غرور صلابت کے ساتھ اس شخص کی مرقد

پر فاتحہ خوان ہوتے ہیں اور مزارِ اقبال کے شمالی جانب روشنائی دروازے کی طرف سر سکندر حیات کی قبر ہے جو دیکھنے کے لیے عبرت اور سوچنے والے کے لیے سامانِ حیرت ہے۔ تھوڑا آگے چل کر مغلیہ سطوت کی نشانی قلعۂ لاہور اور رنجیت سنگھ کی مڑھی پنجاب میں سکھ راج کے مظالم کی گواہ ہے۔

پیارے احمد! بادشاہی مسجد کے میناروں اور مینارِ پاکستان کے درمیان تھوڑی سی مسافت تین گم شدہ صدیوں پر محیط ہے۔ اگر آپ کو اِن گم شدہ صدیوں کا مطالعہ مقصود ہو تو جناب مختار مسعود کی شہرہ آفاق تصنیف ''آوازِ دوست کا مطالعہ فرمائیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں اِن تین گم شدہ صدیوں کا ماتم کر رہا تھا تو بادشاہی مسجد کے مینار نے جھک کر میرے کان میں راز کی بات کہہ دی۔ ''جب حق کی جگہ حکایت اور جہاد کی جگہ جمود لے لے ...... جب ملک کی بجائے مفاد اور ملت کی بجائے مصلحت عزیز ہو۔ جب زندگی سے محبت اور موت سے خوف آنے لگے تو صدیاں یونہی گم ہو جاتی ہیں۔''

احمد! مینارِ پاکستان مسلمانوں کی تحریکِ آزادی کی دل گداز اور طویل داستان کی علامت ہے۔ یہ مسلمانوں کی عاقبت نااندیش چالوں پر ماتم کناں بھی ہے۔ یہ مینار فکرِ فردا کا مظہر اور خونِ تمنا پر نوحہ کناں ہے۔ بعد ازاں میں مینارِ پاکستان کی عظمت اور صداقت کے بعد بادشاہی مسجد کے شکوہ میں ایسا کھویا کہ پھر کچھ یاد نہیں رہا۔

والسّلام

آپ کا خیر اندیش

رول نمبر ....

☆☆☆☆☆☆

معذرت نامہ

(دوست کے ہاں شادی کی تقریب میں عدم شرکت کا معذرت نامہ)

کمرۂ امتحان

یکم دسمبر 2013ء

امجد صاحب!

السلام علیکم! کس حال میں ہیں؟ مصروفیات کا کیا عالم ہے؟ زندگی میں تبدیلی کیسی محسوس ہو رہی ہے؟ یقیناً ’’آپ خوش ہوں گے۔‘‘ گلشن کا کاروبار خوب چل رہا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہر قدم پر آپ کا حامی و ناصر ہو۔ آپ کا فرستادہ خوب صورت شادی کارڈ ملا۔ دیر سے ملا، آخر ملا۔ میں اُن دِنوں بیرونِ ملک گیا ہوا تھا۔ جاتے وقت آپ کو اطلاع بھی نہ کر سکا۔ آپ کی شادی کی تاریخ کے دس دن بعد وطن واپس آیا تو اہلِ خانہ نے مجھے آپ کی شادی اور شادی کارڈ کی اطلاع دی۔ اب وقت کے گراں پہیے کا رخ موڑنا کسی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ کسی نے ٹھیک ہی تو کہا ہے:

سدا عیشِ دوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں (میر حسن)

بھائی صاحب! اِس امر کو میری مجبوری سمجھ کر معاف کر دینا۔ آپ کو اِس سے کیا فرق پڑ سکتا تھا۔ آپ تو شادی جیسے مقدس فریضے سے عہدہ برآ ہو ہی گئے ہیں۔ میں اِس سے محروم رہا ہوں۔ جس کا قلق مجھے عمر بھر رہے گا۔ مَیں پہلی فرصت میں آپ کے ہاں حاضر ہو کر

معذرت کروں گا اور اپنی شومیٔ قسمت کا رونا بھی روؤں گا۔

امیدِ واثق ہے کہ آپ میری معذرت کو مجبوری جان کر شرفِ قبولیت بخشیں گے اور اعلیٰ ظرف دوست کی طرح میری خطا کو بھی دوست کی ادا سمجھ کر معاف کر دیں گے۔ آپ کو یہ شادی خانہ آبادی مبارک ہو۔ آپ کی آرزوؤں کا یہ چمن ہمیشہ شاد باد اور بامراد رہے۔ پہلی فرصت اور فراغت میں آپ کو باقاعدہ مبارک باد دینے کے لیے شادی کا تحفہ لے کر حاضر ہوں گا۔

آپ کے والدین اور بہن بھائیوں کو میرے اہلِ خانہ کی طرف سے تہہِ دل سے مبارک باد۔

والسلام

آپ کا مخلص دوست

ا۔ب۔ج

☆☆☆☆☆☆

ورزش کی افادیت

(جسمانی ورزش بیماریوں سے نجات کا ذریعہ)

امتحانی مرکز

۲۰ دسمبر ۲۰۲۰ء

پیارے بلال! (میرے پیارے دوست!)

السّلامُ علیکم! اس خبر نے تو مجھے افسردہ خاطر کر دیا تھا کہ آپ اکثر بیمار رہتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بیماریاں آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتی ہیں۔ میرے خیال میں یہ سب کچھ بے احتیاطی کا نتیجہ ہے یا صحت کے اصولوں سے عدم توجہی۔ ضرب المثل ہے: پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ جسمانی ورزش کے ذریعہ سے بیماریوں پر غالب آسکتے ہیں۔ داناؤں کا کہنا ہے کہ جسمانی ورزش بیماریوں سے نجات کا ذریعہ ہے۔ کہتے ہیں توانا جسم، توانا دماغ۔ جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق صحت مند زندگی گزارنے کے لیے جسمانی ورزش بہت ضروری ہے۔ تمام ڈاکٹرز ہارٹ اور شوگر کے مریضوں کو بالخصوص اور دیگر مریضوں کو بالعموم صبح وشام سیر کرنے اور ہلکی پھلکی ورزش کرنے کا مفید مشورہ دیتے ہیں۔ آپ نے انگریزی مقولہ "Morning walk makes a man healthy, wealthy and strong." تو سُنا ہوگا۔ کہتے ہیں کھیل کے وقت کھیل زیبا۔ ورزش کرنے سے دورانِ خون کا نظام درست اور رواں ہوتا ہے۔ نظامِ انہضام میں بہتری آتی ہے۔ کہتے ہیں جہاں کھیل کے میدان آباد ہوتے ہیں وہاں ہسپتال ویران ہو جاتے ہیں۔ اب تو فزیوتھراپی کو باقاعدہ سائنس کی شاخ اور علاج کا ایک طریقہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اسے میڈیکل سائنس میں داخل کر لیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری نصیحتوں پر عمل کریں گے۔

والسّلام

آپ کا مخلص

احمد بلال

ڈپٹی کمشنر کے نام

سٹریٹ کرائم کے خاتمے کے لیے

امتحانی مرکز

۳/ اکتوبر ۲۰۲۰ء

بخدمت جناب ڈپٹی کمشنر صاحب ا۔ب۔ج

السّلامُ علیکم! ہم اہلِ محلّہ .... تحصیل .... ضلع .... آپ کی توجہ اِس امر کی جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ ہمارے شہر میں بالعموم اور ہمارے محلّے میں بالخصوص سٹریٹ کرائم میں آئے روز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔شام کے دھندلکے کے آغاز سے ہی مختلف وارداتیں وقوع پذیر ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔کوئی موبائل چھین کر لے جاتا ہے تو کوئی ساتھ نقد رقم بھی لے اُڑتا ہے۔جیب تراشوں کی رنگا رنگ داستانوں کی دھوم پورے شہر میں مچی ہوئی ہے۔رات گئے خصوصاً رات کے آخری پہر میں ڈاکہ ڈالنے کے واقعات سننے میں آتے رہتے ہیں۔کسی شہری کا مال محفوظ نہیں اور نہ جان وآبرو محفوظ ہے۔ ہر ایک کے دل میں ایک دھڑ کا لگا رہتا ہے۔شہر میں گشت اور چوکیداری کا نظام نہ ہونے کے برابر ہے۔آپ پورے ضلع کے سرپرستِ اعلیٰ ہیں۔آپ کی نیک نامی اور شہرت کے چرچے زبان زدِ خاص وعام ہیں۔آپ مہربانی فرما کر پولیس کے سربراہ ڈی۔ پی۔او صاحب کو پابند کریں کہ شہر کے گلی کوچوں، مختلف چوکوں میں گشت ونگرانی کا باقاعدہ سلسلہ جاری کریں۔تنہا پولیس اِس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔ پولیس کی نگرانی میں محلّہ کمیٹیاں قائم کی جائیں۔عوام میں پولیس کا اعتماد بحال ہونے کی اشد ضرورت ہے۔عوام کے تعاون اور پولیس کے ہمدردانہ رویّہ سے یہ معرکہ سر ہوسکتا ہے۔براہِ مہربانی یہ معاملہ آپ کی ذاتی دلچسپی کا متقاضی ہے تاکہ خلق خدا کا بھلا ہو۔

والسّلام

نیازمندان......اہلِ محلہ

پتا ....

حادثات کی روک تھام

ٹریفک کے مسائل

امتحانی مرکز

۱۳/ اکتوبر ۲۰۲۰ء

بخدمت جناب مدیر روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور

مکرّمی! سلامِ مسنون۔

میں آپ کے مؤقر روزنامے کی وساطت سے متعلقہ حکام اور ہم وطن بھائیوں کی توجہ عہدِ حاضر کے ٹریفک کے مسائل کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ اِن مسائل اور ہماری غفلت کے سبب ہماری شاہراہیں قتل گاہیں بن چکی ہیں۔ ہر روز متعدد قیمتی جانیں حادثات کے سبب ضائع ہو جاتی ہیں۔ انسانی خون کی ارزانی دیکھ کر دل میں ہول اُٹھتے ہیں۔ ڈرائیوروں کی تیز رفتاری کی روِش، حکومتی اہل کاروں کی لاپروائی، کم سن لڑکوں کی بے ہنگم ڈرائیونگ، لائسنسنگ کے بغیر ڈرائیونگ کی اجازت، ٹریفک قواعد سے لاعلمی حادثات کی بڑی بڑی وجوہات ہیں۔ ان پر ہر صورت قابو پانا ضروری ہے۔ چند تجاویز پیشِ خدمت ہیں:

۱۔ ڈرائیوروں کی فنی اور اخلاقی تربیت کا دونوں صورتوں میں اہتمام کرنا چاہیے۔

۲۔ سکوٹر، سائیکل اور چاند گاڑی چلانے کی اجازت کے لیے ایک عمر کا تعین ہونا ضروری ہے۔

۳۔ پولیس کو توجہ اور تن دہی سے خدمات انجام دینی چاہئیں۔ چیک پوسٹوں کی

۴۔ رواں دواں بسوں پر چھاپے مارنے کا انتظام بھی ضروری ہے۔

۵۔ غیر محتاط ڈرائیوروں کے لائسنس منسوخ کر دیے جائیں۔

۶۔ تعلیمی اِداروں، دینی مدارس اور میڈیا پر ٹریفک کے اصولوں کی پاسداری کا اہتمام ہونا چاہیے۔

۷۔ سزا اور جزا کا مکمل نظام بہت ضروری ہے۔

یہ ہیں وہ امور جن پر حکومت کو توجہ دینی چاہیے۔ ہمیں انفرادی طور پر اچھے شہری ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے ٹریفک کے قوانین پر سختی سے عمل پیرا ہونا چاہیے۔ دورانِ سفر سواریوں کو بھی ڈرائیوروں کی تیز رفتاری اور عدم احتیاط کا نوٹس لینا چاہیے۔ انسانی جانوں کی قدر و قیمت کا احساس ہر سطح پر اُجاگر کرنا ضروری ہے۔ اصلاح کا کام واقعی فرد سے شروع ہو کر اقوام تک پہنچتا ہے۔ حکومت بھی افراد کو تیار کرنے میں پیش پیش ہو تو اصلاح کی صورت یقینی ہے۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کِشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

تاریخ .... والسلام

پتا: .... نیازمند

دل گداختہ شہری

☆☆☆☆☆☆

ہم نصابی سرگرمیوں کی افادیت

امتحانی مرکز

۱۷/ دسمبر ۲۰۱۹ء

پیارے احمد!

السّلامُ علیکم!

بعد از دعائے درازیِ عمر واضح ہو کہ پورا خاندان آپ کے رویہ اور محنت پر بہت خوش ہے۔ ٹھیک ہے کہ آپ کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہے۔ آپ خوب دل لگا کر تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ خوب! بہت خوب!! خدا آپ کو ہمت دے۔ مگر بھائی! تعلیم کے ساتھ ساتھ تفریحی مشاغل، کھیل کود، تحریری و تقریری سرگرمیاں بھی بہت ضروری ہیں۔ کھیلوں سے سپورٹس مین سپرٹ پیدا ہوتی ہے۔ انگریزی ضرب المثل تو آپ نے پڑھ رکھی ہوگی: "A sound mind is in sound body." پھر تندرستی ہزار نعمت ہے۔ کرمِ کتابی بن کر معاشرے کا فعال رکن بننا ممکن نہیں ہے۔ جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق ہر آدمی کے لیے ہر روز صبح و شام 25 تا 30 منٹ سیر یا ہلکی پھلکی ورزش ضروری ہے۔ کھیلوں کے ساتھ ساتھ دیگر ہم نصابی سرگرمیاں بھی معاشرے کا فعال رکن بننے کے لیے ضروری ہیں۔ تقریری مباحثہ جات سے آدمی کا اعتماد بڑھتا ہے۔ تحریری مقابلہ جات کے ذریعے لکھنے کا فن آتا ہے۔ معلومات کی ترتیب و تدوین میں مدد ملتی ہے۔ لہٰذا میرا مشورہ ہے کہ آپ کالج کی ہم نصابی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیں۔ اِس ریاضت سے آپ کی شخصیت کا پھول کھلے گا اور آپ معاشرے کے لیے مفید شہری ثابت ہوں گے۔

تمام اہلِ خانہ کی دُعائیں اور نیک تمنّائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

والسّلام

آپ کی بڑی آپی

ا۔ب۔ج

ملاوٹ کی لعنت

(دوست کے نام تاثرات)

امتحانی مرکز

۲۰/دسمبر ۲۰۲۰ء

پیارے دوست راحیل!

السّلامٌ علیکم!

کس حال میں ہیں یارانِ وطن؟ شب و روز کیسے بسر ہو رہے ہیں؟ یار! میں آپ کے ساتھ یہ بات شیئر (Share) کرنا چاہتا ہوں کہ ہم کس قدر اخلاقی اور قانونی گراوٹ کا شکار ہو چکے ہیں۔ ہمارے ہاں خوردنی اشیاء میں ملاوٹ کا رجحان روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے نئے نئے گھٹیا طریقے بھی رواج پا رہے ہیں۔ اب تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خالص چیز ملنا ناممکن ہوتی جا رہی ہے۔ گوالوں کا دودھ میں پانی ملانا تو سُنا ہی تھا، اب تو کیمیکل سے دودھ اور مصنوعی انڈے بنا کر دھڑا دھڑ سرِ عام دن کے اُجالے میں فروخت ہو رہے ہیں۔ زر پرستی نے کیا کیا رنگ دِکھائے ہیں۔ ضمیر مُردہ ہو چکے ہیں۔ آٹے میں ملاوٹ، مرچوں میں ملاوٹ، ہلدی اور گرم مصالحہ جات میں ملاوٹ کے چرچے زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ یہ انسانیت دشمن لوگ ہماری زندگیوں میں زہر گھول رہے ہیں۔ ملکی قانون تو ایک طرف، یہ مذہبی تعلیمات سے بھی روگردانی کرتے ہیں۔ لوگ ختمی مرتبت محمدِ عربی ﷺ کا فرمان بھول گئے ہیں:

"مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا یعنی جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں۔"

قرآنِ پاک میں بھی ملاوٹ کرنے کے خلاف سخت احکامات موجود ہیں۔ مگر دولت کی ہوس نے انھیں اندھا کر دیا ہے۔ حکومتی سطح پر اس کے خلاف بھرپور کارروائی ہونی چاہیے۔ ہمارے مدارس، مکاتب، مساجد، اساتذہ، ائمہ اور میڈیا کو بھی اِس مذموم فعل کے خلاف بھرپور مہم چلانی چاہیے تاکہ انسانی زندگی محفوظ ہو سکے۔

والسلام

آپ کا مخلص احمد ندیم

مہنگائی کے مسائل

امتحانی مرکز

15/ دسمبر 2020ء

بخدمت جناب مدیر روز نامہ ''نوائے وقت'' لاہور

مکرّمی ومحترمی! سلامِ مسنون۔

میں آپ کے مؤقر روز نامے کی وساطت سے متعلقہ حکام اور ہم وطن بھائیوں کی توجہ مہنگائی اور اس کے بڑھتے ہوئے مسائل کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ اس میں حکومتِ وقت، سرکاری اہل کاروں کے ساتھ عوام میں ذخیرہ اندوزوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ عوام کا باشعور ہونا بہت ضروری ہے۔ عوام کے تعاون کے بغیر حکومت کی ہر کوشش نقش برآب ثابت ہوگی۔ حکومتی عملہ دفتروں سے باہر نکل کر عملی اقدامات کرنے سے قاصر ہے۔ ہمارے ملک میں بلدیاتی نظام کو کبھی پذیرائی حاصل نہیں رہی۔ جمہوری حکومتیں اس جمہوری عمل میں ہمیشہ رکاوٹ رہی ہیں۔ ہاں مارشل لاء کے زمانے میں مختلف طرز کے بلدیاتی نظام دیکھنے کو ملے ہیں۔ اگر یہ بلدیاتی اِدارے بنتے ہیں تو وہ بہت اختیار رکھتے ہیں۔ مہنگائی کے دو بڑے سبب ہوتے ہیں:

۱۔ ایک موسموں کے سبب غذائی قلت اور اشیائے صرف کی قیمتوں میں اضافہ۔

۲۔ منافع خوری کے رجحان کے باعث ذخیرہ اندوزی کر کے مصنوعی قلت پیدا کرنے کا رُجحان۔

ہمارا معاشرہ اور ہمارا میڈیا بھی افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ موسموں کی تبدیلی کے باعث غذائی قلت کا علاج تو قناعت اور صبر کے ساتھ ہے۔ ٹماٹر موسم کی فصل ہے۔ اگر اِس کی قیمت گرمیوں میں 20 روپے کلو ہوتی ہے تو سردیوں میں -/200 روپے کلو ہوگی۔ اس میں منفی پروپیگنڈے کی کوئی ضرورت نہیں۔ زندہ قوموں کا ایک واقعہ سُنیے: جنگِ عظیم دوم کے زمانے میں برطانوی وزیرِ اعظم چرچل نے چینی کے استعمال پر پابندی لگا دی۔ ہمارے گاؤں کے ایک

میجر برطانوی ہم منصب سے ملاقات کے لیے گئے۔ اُنھیں چائے پیش کی گئی۔ اُن کے کپ میں چینی ڈالی مگر خود نہیں ڈالی۔ استفسار پر بتایا کہ وزیرِ اعظم چرچل نے روک رکھا ہے۔"

ہمیں اپنے مارکیٹ کمیٹی کے نظام میں بہتری لانے کی ضرورت ہے۔ لوگوں میں اگر خوفِ خدا ہوگا تو وہ ذخیرہ اندوزی سے رکیں گے۔ ہمارے مدارس، مکاتب اور میڈیا کو یہ کام اپنے ذمہ لینا ہوگا۔ اگر ہماری تعلیم کا قبلہ درست ہو جائے، ذمہ داری کا احساس پیدا ہو جائے، اچھا شہری اپنے حقوق و فرائض سے واقف ہو تو سدھار کی صورت یقینی ہے۔ قعرِ دریا میں بھی آنکلے گی سورج کی کرن۔

والسّلام

نیاز مند

وطنِ عزیز کا ایک دردمند شہری

☆☆☆☆☆☆

نظامِ تعلیم کی خامیاں

امتحانی مرکز

۱۱/نومبر ۲۰۲۰ء

مکرمی مدیر روزنامہ ''جنگ'' لاہور

سلامِ مسنون!

میں نے آپ کے مؤقر روزنامہ کے ذریعے موجودہ نظامِ تعلیم کی خامیوں کو اُجاگر کرنا ہے تاکہ اہلِ دانش اور اربابِ اقتدار اصلاحِ احوال کی جانب متوجہ ہوسکیں۔ اِس میں اپنا بھی بھلا ہے اور قوم کا بھی۔ بے شک تعلیم ہی انسان سازی اور تعمیرِ شخصیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اندازِ تعلیم ہی کسی قوم کے تہذیبی اور ارتقائی رخ کا تعیّن کرتا ہے۔ مگر افسوس کہ ہمارا نظامِ تعلیم وہ خاطر خواہ کامیابی نہیں دے سکا جو ہمارا مقصود تھا۔ نظامِ تعلیم کی تین اہم جہتیں ہیں: "Why, What and how to teach." "Why" ''کیوں'' مقاصدِ تعلیم، "What" ''کیا'' نصابِ تعلیم اور "How" ''کیسے'' طریقۂ تدریس ہیں۔

ہمارا نظامِ تعلیم ہمارے قومی اور اِسلامی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں۔ ابھی تک ہم نے اپنے مقاصد کا صحیح تعیّن بھی نہیں کیا۔ ہمارا نظامِ تعلیم دوئی کا شکار ہے۔ نہ یکساں مدارس، نہ یکساں نصاب، جس وجہ سے قومی وحدت پیدا نہیں ہوسکی۔ ''نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم'' والا معاملہ ہے۔ نصابِ تعلیم جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں۔ طریقۂ تدریس بھی روایتی اور فرسودہ ہے۔ ہم مکتب کی فضا، تعلیم کے تقدس اور نصاب کی عظمت سے واقف نہیں۔ اساتذہ میں صلاحیت تو ممکن ہے مگر صالحیت نہیں۔ خداوندانِ مکتب شاہین بچوں کو خاک بازی کا سبق دے رہے ہیں۔

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

ہمارا ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے۔ ذریعۂ تعلیم قومی زبان کو ہونا چاہیے۔ غیر ملکی زبان

سیکھنے میں وقت، توانائی اور پیسے کا ضیاع بھی ہوتا ہے اور تصوّرات بھی واضح نہیں ہوتے۔ جب زبانِ غیر میں شرحِ آرزو ممکن نہ ہو تو تدریس و تعلیم مؤثر اور سہل کیسے ہوگی۔ دنیا کی تمام ترقی یافتہ اقوام نے اپنی اپنی قومی زبانوں کے ذریعے علوم و فنون سیکھ کر مطلوبہ مقاصد حاصل کیے۔ بات صرف سائنسی علوم کی نہیں باقی علوم میں بھی ہماری یہی حالت ہے۔ مادی اور نفسی نفسی کے عہد میں درس گاہیں نجی ٹیوشن سنٹرز میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ نجی سکولز اور کالجز تجارت گاہیں ہیں۔ پبلک اور سرکاری سکولز اور کالجز کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ اصلاحِ احوال کی تدبیر کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ سوسائٹی ذہین اور اعلیٰ افراد پیدا کرنے کے بعد بانجھ ہو جاتی ہے۔ اب اہلِ دانش اور باصلاحیت افراد کی ذمہ داری ہے کہ آگے بڑھیں۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

والسّلام

نیاز مند

ایک دردمند شہری

☆☆☆☆☆☆

منشیات کا بڑھتا رجحان

امتحانی مرکز

۱۱/نومبر ۲۰۲۰ء

مکرمی مدیر روز نامہ ''جنگ'' لاہور

سلامِ مسنون!

میں آپ کے مؤقر روز نامہ کے ذریعے عوام اور حکومت کی توجہ اِس امر کی جانب مبذول کروانا چاہتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں نوجوان نسل میں منشیات کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

سڑکوں، فٹ پاتھوں اور پارکوں میں اِن بے سہارا لوگوں کی بڑی تعداد دیکھی جا سکتی ہے۔ اِس رُجحان کی کئی وجوہات ہیں:

۱۔ نوجوانوں میں بے راہ روی کی بڑھتی روِش۔

۲۔ حکومت اور کار پردازانِ حکومت کی عدم توجہی۔

۳۔ منشیات ''مافیا'' کی ہوسِ زرگری اور زر پرستی۔

ہم چھوٹے چھوٹے نشہ کرنے والوں کو تو پکڑ کر قید خانوں میں بھیج دیتے ہیں لیکن ''منشیات مافیا'' اور اُن کے گلی گلی، کوچوں کوچوں میں کار پردازان کو کوئی پوچھتا نہیں۔ بڑے افسوس کے ساتھ یہ بات کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ اکثر مافیا کے ساتھ ہماری پولیس کے بعض اہل کار شامل ہوتے ہیں یا پھر ''منشیات مافیا'' کے لمبے ہاتھ ہیں جن سے شاہی اقتدار کو جنبش ہوتی ہے۔ نشہ کی یہ لت ملک وملت کے نوجوانوں کے لیے سمِ قاتل ہے۔ وہ اپنی طبعی عمر سے پہلے ہی جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ صحت مند زندگی بھی نہیں گزار سکتے بلکہ معاشرے پر بوجھ ہوتے ہیں۔ صحت مند افراد سے ہی صحت مند معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ ایک طرح سے یہ ہمارا قومی المیہ ہے جس کی طرف بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ شاید بہتری کی کوئی صورت نکلے۔ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ۔

والسلام

نیاز مند: ایک حساس شہری

گلاب کے پھول کی آپ بیتی

لاریب میں حسین و جمیل ہوں۔ مجھے پھولوں کی ملکہ بھی کہا جاتا ہے اور چمن کا بے تاج بادشاہ بھی۔ دنیا کے ہر ادب میں میرے چرچے ہیں۔ میں نے شاعروں کے تخیّل کو حُسن، ادیبوں کے قلم کو رعنائی، فلسفیوں کی فکر کو رفعت اور اہلِ دل کو خدا شناسی کا شعور عطا کیا ہے۔ میری ہر پتی معرفت کا ایک حسین ورق ہے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ اپنے مُنہ میاں مٹھو بننا اہلِ دانش کو زیب نہیں دیتا مگر مَیں نے جو کچھ کہا اُس سے کہیں بڑھ کر صفات دُنیائے علم و اَدب میں موجود ہیں۔

کائنات کی رعنائیاں، قلم کا ذوق اور زندگی، بلبل کے ترانے اور حکماء کے مرتبان میرے مفید اور حسین ہونے پر شاہدِ عادل ہیں۔ آؤ کسی شاعر سے پوچھ لیتے ہیں:

پھولوں کے دل ہیں شرحِ محبت سے چاک چاک
کلیوں کے دل ہیں حرفِ تمنّا لیے ہوئے

صاحبو! میں پھول بننے سے پہلے گلاب کی شاخ پر منہ بند کلی کی شکل میں تھا۔ میں نے اِس عالم میں صبح و شام کی بہت سی گردشیں دیکھیں، موسموں کے بدلتے مزاج کی تلخیوں کو محسوس کیا۔ ہوا کے بے رحم جھونکوں کی چھیڑ چھاڑ مجھے اب بھی ذرا ذرا یاد ہے، کلی کو کھلنے اور پھول بننے کے لیے جاں گداز مرحلوں کا ذکر چھوڑیئے۔

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب!
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اگرچہ میرے لب تو بند ہیں مگر دل میں ایک الاؤ ہے۔ میں بھی احساس کی دنیا کا مسافر ہوں۔ میں پھول بننے سے پہلے ایک شاخ پر بند کلی کی شکل میں تھا۔ صبح و شام کی کتنی گردشیں ایسے ہی گزر گئیں۔ شبنم کے قطرے صبح کی مسکراہٹ کی صورت اور رات کے آنسو بنتے رہے۔ ایسے میں ایک روز بادِ صبا کی شوخی سے میں کھل اُٹھا۔ مَیں ایک تازہ مہکتا گلاب کا پھول تھا۔ صحنِ چمن کی

ہر شے نے مسرت و شادمانی سے میرا استقبال کیا۔شبنم کے قطروں سے میں نے وضو کیا۔بلبلوں کے چہچہے میرے لیے بانگِ اذان تھے ۔میں اہلِ گلشن کے ساتھ خدا کی تسبیح میں مصروف ہوگیا۔ دیکھنے والے سمجھتے تھے کہ میں مسکرا رہا ہوں ۔مجھے اپنی خوب صورتی پر ناز ہے ۔ایسا ہر گز نہیں ۔مجھے معلوم تھا کہ:

''حسیں وہی ہے، حقیقت زوال ہے جس کی۔''

ایسے امید و رجا، یاس و خوف کے لمحے میری زندگی کا حاصل تھے ۔وہی ہوا جو ہونا تھا۔ ایک دن ایک افسردہ شخص باغ میں آیا۔اُس وقت باغبان موجود نہ تھا۔اُس نے شاخ سے پھولوں کو نوچنا شروع کیا۔یہاں تک کہ اُس کا ہاتھ میرے دامن تک پہنچا۔اُس نے شانِ بے نیازی سے مجھے توڑا اور تھیلے میں ڈال لیا۔کہاں وہ نزاکتیں اور کہاں یہ بے مروّتی ۔اُس شخص نے تھیلے کو بغل میں دبایا اور ایک نامعلوم سڑک کی طرف چل نکلا۔راستے میں بازار بھی آئے،لوگوں کی ملی جلی آوازیں بھی سُنیں ۔وہ چلتا رہا، چلتا رہا۔آخر ایک مقام پر رک گیا۔میرے دل میں مسرت کی ایک لہر اُٹھی ۔شاید ان دم بخود لمحوں سے نجات کی صورت پیدا ہوئی ہے ۔اچانک اُس نے تھیلے کو بغل سے نکالا اور شانِ بے نیازی سے مٹی کے ایک ڈھیر پر اُلٹ دیا۔غور سے دیکھا تو وہ ایک قبر تھی ۔تقدیر کی شوخی دیکھیے ۔کہاں بہار کا حسن، چمن کی شادابی، ہواؤں کا خرام اور بلبلوں کے ترانے، کہاں قبرستان کا تنہا، اُداس اور افسردہ گوشہ ۔وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ

سُن لی میری آپ بیتی .... جس میں عبرت بھی ہے اور نصیحت بھی، حیرت بھی ہے اور حسرت بھی، مسرت بھی اور درد بھی، شگفتگی اور اُداسی بھی ۔میں پھول ہوں ۔رنگ دلکش اور مہک دل آویز ۔میں کسی عاشق کی جانب سے محبوب کے لیے ۱۴ فروری کا تحفہ بھی ہوسکتا تھا۔کسی گلدستے کی زینت بھی،کسی دوشیزہ کے بالوں کو حُسن عطا کرسکتا تھا یا کسی دُلہا کے گلے کا ہار بھی مگر:

ہر پھول کی قسمت میں کہاں نازِ عروساں کچھ پھول تو کھلتے ہیں مزاروں کے لیے

تقدیر کا لکھا کیسے مٹ سکتا ہے ۔اب میں ہوں اور بے نام قبر کا گوشۂ تنہائی ۔

درد ہو دل میں تو دوا کیجئے دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجئے

☆☆☆☆☆☆

(ب) مختصر مکالمے

علم کے فائدے

منظر: (احمد اور شاہد دونوں قریبی دوست ہیں۔احمد تعلیم میں دلچسپی لیتا ہے جب کہ شاہد نے پڑھائی چھوڑ دی ہے۔سرِراہ دونوں کی ملاقات ہوتی ہے)

احمد: السّلامُ علیکم! شاہد کہاں گم ہو گئے ہو؟

شاہد: وعلیکم السّلام دوست! میں نے سکول چھوڑنے کا اِرادہ کرلیا ہے۔

احمد: وہ کیوں؟ کیا کوئی معاشی مسئلہ ہے؟

شاہد: ہرگز نہیں، بلکہ ابو تو چاہتے ہیں کہ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھوں، مگر دل پر کسی کا قابو نہیں۔

احمد: دوست! آپ بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔علم ہر عہد کی ضرورت رہا ہے اور اب تک تو اس کی اہمیت دو چند ہوگئی ہے۔

شاہد: ایسا بھی نہیں ہے۔ہمارے گرد وپیش بہت سے لوگ ایسے ہیں جنھوں نے علم حاصل کیے بغیر دولت جمع کرلی ہے۔

احمد: بات دولت اور سرمائے کی نہیں بلکہ عزت اور احترام کی ہے۔خدا کی معرفت کی ہے۔علم کے بغیر دُنیا بنتی ہے نہ آخرت۔

شاہد: یار! تمام گھر والے بھی ہر وقت اِسی طرح کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔مگر کیا کروں؟ طبیعت ادھر مائل ہی نہیں ہوتی۔

احمد: شاہد! دل تو خواہشات پر قابو پانا بہت ضروری ہے۔آرزو کے گھوڑے کو بے لگام نہیں چھوڑا جا سکتا۔

شاہد: تو پھر اِس کا طریقہ کیا ہے؟

احمد: اِس کا طریقہ بھی تعلیم اور علم میں ہی ہے۔علم انسان کو جوہرِ انسانیت عطا کرتا ہے۔نفس پر قابو پانے کا طریقہ بتاتا ہے۔مادی اور اخلاقی ہر طرح کی ترقی اس میں مضمر ہے۔

شاہد: مگر میں نے بہت سے پڑھے لکھے لوگ جھوٹ بولتے اور رِشوت لیتے دیکھے ہیں۔اُن میں حلال اور حرام کی تمیز نہیں۔

احمد: اِس میں علم کا قصور نہیں۔اُن کی ذاتی ترجیحات کا دخل ہے۔آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟ اکثر اہلِ علم ہی با کردار، پاک باز اور راست فکر اور راست رو ہوتے ہیں۔یہ بھی تو علم کی دین ہے۔قرآنِ پاک میں اِرشاد ہے: ''بے علم اور اہلِ علم کبھی برابر نہیں ہوسکتے۔'' آدم کی فضیلت بھی علم کے سبب ہے۔

شاہد: یار! آپ کی باتیں تو دل پر اثر کرنے لگی ہیں۔میں آپ کا ہم خیال ہوتا جا رہا ہوں۔

احمد: دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے۔ (اقبال)

شاہد: اچھا! آج ابّا سے بات کر کے دوبارہ پڑھائی کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔تم میری کیا مدد کرو گے؟

احمد: میں ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔مالی، اخلاقی اور تعلیمی ہر سطح کی۔

شاہد: مالی اعانت کی تو ضرورت نہیں البتہ تعلیمی میدان میں گاہے گاہے آپ سے مشورہ کرتا رہوں گا۔

احمد: دیدہ و دِل فرشِ راہ ہیں۔خدا مجھے توفیق دے کہ آپ کی مدد کرسکوں۔میرا تو ایمان ہے:

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے آتے ہیں جو کام دوسروں کے

شاہد: یار! آپ نے تو میری آنکھوں پر بندھی پٹی کھول دی ہے۔اللہ آپ کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

احمد: ٹھیک۔بہت خوب! یہ آپ کا حُسنِ ظن ہے ورنہ مجھ عاجز کی کیا اوقات؟

شاہد: وقت بہت ہوگیا ہے۔گھر والوں سے بھی مشورہ کرنا ہے۔اِن شاءاللہ ملاقات کا سلسلہ جاری رہے گا۔خدا حافظ۔

احمد: اچھا! یار زندہ صحبت باقی۔پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔

(پردہ گرتا ہے)

دو لڑکیوں کے مابین جہیز کے موضوع پر مکالمہ

منظر: (عالیہ اور غالیہ گہری دوست ہیں۔ عالیہ کی شادی کے دن قریب آرہے ہیں۔ اُس کی دوست غالیہ اُس سے ملنے آتی ہے اور اُسے پریشان دیکھتی ہے۔

غالیہ: السّلامُ علیکم! عالیہ! چپ چپ بیٹھی ہو؟

عالیہ: وعلیکم السّلام! بہت دِنوں بعد آئی ہو۔

غالیہ: ہاں، فرصت ہی نہ ملی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے: ”تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے۔“

عالیہ: تم اپنے کام سنبھالو، دوستی بعد میں دیکھی جائے گی۔ اِتنا بھی نہیں معلوم: ”کس حال میں ہیں یارانِ وطن؟“

غالیہ: ایسا بھی نہیں۔ ”دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار۔“ اچھا بتاؤ، پریشان دِکھائی دیتی ہو۔ بات کیا ہے؟

عالیہ: پریشانی تو ہوگی۔ شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں اور ابھی تک جہیز بھی نہیں بن سکا۔ ابّا جی کہتے ہیں: ”میں جہیز نہیں دُوں گا۔“

غالیہ: تو تم کیوں پریشان ہو؟ کیا شادی کے لیے جہیز ضروری ہے؟

عالیہ: تو اور کیا؟ جہیز کے بغیر دُلہن کی کیا عزت رہ جاتی ہے؟

غالیہ: یہ کیا بات ہوئی؟ ایک آدمی بیٹی بھی دے اور جہیز بھی۔

عالیہ: جب سب لوگ جہیز دیتے ہیں تو ہمیں بھی تو دینا پڑے گا۔

غالیہ: مجھے تو چچا جان کا فیصلہ بہت پسند آیا ہے۔ اب جہیز کی لعنت کو ختم ہونا چاہیے۔

عالیہ: غریب تو چلو جہیز نہیں دے سکتے۔ ہمارے پاس کس بات کی کمی ہے؟

غالیہ: بات امارت اور غربت کی نہیں، بات تو حقیقت اور صداقت کی ہے۔

عالیہ: صداقت کیا ہے؟

غالیہ: آپ جانتی ہیں کہ جہیز ایک معاشرتی روگ ہے۔ بہت سی بچیوں کے بالوں میں چاندی آ

جاتی ہے، مگر اُن کے ہاتھ پیلے نہیں ہوتے۔

عالیہ: مجھے نصیحتیں نہ کرو۔ میرا دل تو پہلے ہی بہت اُداس ہے۔

غالیہ: عالیہ! ہمارا دین بھی اِن خرافات سے منع کرتا ہے۔ یہ خالصتاً ہندوؤں کی رسم ہے۔

عالیہ: تم باتیں تو بہت کرتی ہو۔ جب تمھاری شادی ہوگی تو پتا چلے گا۔

غالیہ: پتا کیا چلنا ہے۔ میں جہیز ہرگز نہیں مانگوں گی۔ اگر کوئی دے گا بھی تو نہیں لوں گی۔

عالیہ: پھر تو میرے سسرال والے مجھے کوئی زیور بھی نہیں پہنائیں گے۔

غالیہ: اِس چاند سے مکھڑے کو زیورات کی حاجت ہی کیا ہے؟ نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی۔

عالیہ: اچھا بابا! تم ذرا چند دن پہلے آجانا۔

غالیہ: ضرور، ضرور! آجاؤں گی۔ تم خوش رہا کرو۔

غالیہ رخصت ہوتی ہے اور پردہ گرتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

انٹرنیٹ............ ایک مکالمہ

منظر: (حامد اور محمود گہرے دوست ہیں۔ایک ماضی اور روایت کا دلدادہ جبکہ دوسرا جدّت اور ترقی کا شیدا)

حامد: السّلامُ علیکم محمود صاحب!

محمود: وعلیکم السّلام! کیسے ہیں؟ کیسے تشریف لائے؟

حامد: بس اِدھر سے گزر رہا تھا،سوچا کہ آپ سے ملتا چلوں۔مجھے معلوم تھا کہ حضرت کمپیوٹر کی دنیا میں مگن ہوں گے۔

محمود: ہاں ٹھیک ہی سوچا آپ نے۔آئیں میرے ساتھ بیٹھیں اور لطف اُٹھائیں۔

حامد: نہیں،نہیں۔میں باز آیا ایسی تفریحات سے جو وقت کا ضیاع ہیں اور مخربِ اخلاق بھی۔

محمود: بھئی مزا خراب نہ کریں۔یہ تو بہت فائدہ مند ایجاد ہے۔خرابی ذہن میں ہوتی ہے ایجاد میں نہیں۔اقبالؒ نے کہا تھا:

آئین نو سے ڈرنا ، طرزِ کُہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

حامد: لیکن میں جب بھی دیکھتا ہوں،آپ طرح طرح کی گیمز کھیلتے ہیں یا طرح طرح کی وڈیوز دیکھتے ہیں۔

محمود: ایسا ہرگز نہیں۔میں تو کبھی کبھار انجوائے کرنے کے لیے ایسا کرتا ہوں۔

حامد: کبھی کبھار نہ کہیں بلکہ اکثر اوقات کہیں۔میں جب بھی آتا ہوں آپ کو اِسی میں مگن دیکھتا ہوں۔

محمود: یار! میں تو ذہنی تکان دُور کرنے کے لیے ایسا کرتا ہوں یا غم کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے۔

حامد: ہاں تکان ضرور دور کریں لیکن ضرورت سے زیادہ استعمال اعصاب،بینائی اور صحت کو متاثر کرتا ہے۔ویسے بھی آپ نے سُن رکھا ہوگا: "Excess of everything is bad." اسلام توازن اور اعتدال کا درس دیتا ہے۔

محمود: جناب مولوی صاحب! میں ایسا بھی نہیں کہ اپنی صحت کا خیال نہ رکھوں۔ چار پانچ گھنٹے انٹرنیٹ یا کمپیوٹر استعمال کرنے سے کون سی صحت بگڑتی ہے۔ وہم کا کوئی علاج نہیں۔

حامد: میں تو آپ کے بھلے کی بات کرتا ہوں۔

محمود: آپ اِس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ انٹرنیٹ ایک بہت مفید ایجاد ہے۔ اِس نے دُنیا کو گلوبل ویلیج بنا دیا ہے۔ ہر طرح کے علم کا حصول بھی اِس سے ممکن ہے۔

حامد: بھئی! میں نے اس ایجاد کے روشن پہلو سے انکار کب کیا ہے؟ میں تو آپ کے طرزِ عمل پر معترض ہوں۔

محمود: اچھا! آپ اِس کے روشن پہلو سے واقف ہیں تو میں بھی اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کا وعدہ کرتا ہوں۔

حامد: ہاں میں آپ کے فائدے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اگر آپ کو احساس ہو گیا ہے تو بہت ٹھیک۔

محمود: میں آپ کی باتوں کا قائل ہو گیا ہوں کہ انٹرنیٹ کے مثبت پہلوؤں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

حامد: شاباش! بہت خوب۔ مجھے اپنے قابلِ فخر دوست سے یہی امید تھی۔

محمود: ہاں، میں آئندہ کوشش کروں گا کہ اِس کے مفید اور ضروری پروگراموں کو استعمال کروں۔

حامد: ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ وعدہ وفا کریں گے۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔ خدا حافظ!

محمود: خدا حافظ! یار زندہ صحبت باقی۔

اختتامی منظر: (حامد کے چہرے پر مبلغ کا فخر ہے اور محمود محبت بھری نظروں سے حامد کو رُخصت کرتا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆

دو نوجوانوں کے درمیان

بے روزگاری کے موضوع پر مکالمہ

منظر: (عمر اور عمیر گہرے دوست ہیں۔ اکثر اکٹھے اُٹھنا بیٹھنا، ایک ساتھ کھانا پینا۔عمیر کچھ عرصے سے غیر حاضر تھا۔واپسی پر عمر تشویش کا اظہار کرتا ہے۔ یوں سلسلۂ کلام شروع ہوتا ہے۔)

عمر: کیوں بھئی عمیر کیسے ہیں؟ کہاں غائب تھے اِتنے دِنوں سے؟

عمیر: بس یار کیا بتاؤں؟ تم تو جانتے ہو کہ آج کل میں بے روزگار ہوں۔سارا وقت روزی کی فکر سر پر سوار۔

عمر: ہاں یہ تو معلوم ہے کہ آپ بے روزگار ہیں لیکن حیرت ہے کہ اب تک آپ کو کوئی ڈھنگ کی نوکری نہیں ملی۔ویسے فکر مندی کی بات نہیں۔دیر آید درست آید۔

عمیر: ٹھیک ہے کہ انسان کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔''پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ۔'' مگر فیض نے کیا خوب کہا تھا:

دُنیا نے تیری یاد سے بے گانہ کر دیا تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

عمر: واہ! بے روزگاری نے تو آپ کو شاعری سکھا دی ہے۔میں دُعا گو ہوں کہ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

عمیر: آپ خوش نصیب ہیں کہ خاندانی کاروبار میں فِٹ ہو گئے ہیں۔نوکری کے لیے دردر کی ٹھوکریں نہیں کھانا پڑیں۔

عمر: ہاں یہ تو ٹھیک ہے کہ میں نے اپنا چلتا ہوا کاروبار سنبھال لیا ہے۔لیکن آپ تو ایک قابل انسان تھے۔آپ کو تو اچھی ملازمت کے حصول میں دِقت نہیں آنی چاہیے تھی۔

عمیر: کاش ایسا ہوتا۔اِدھر کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔موزوں کیا، غیر موزوں ملازمت کے لیے بھی کئی پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔

عمر: ایسا بھی کیا ہوگیا ہے؟ بے روز گاری کا دَور دَورہ ہے۔ پھر بھی لوگوں کو ملازمتیں تو مل رہی ہیں۔

عمیر: یہ قسمت کے سودے ہیں۔ سفارش یا رِشوت کی کرامات ہیں۔ مرزا محمود سرحدی نے کیا خوب نقشہ کھینچا ہے:

نوکری کے لیے اخبار کے اعلان نہ پڑھ جان پہچان کی باتیں ہیں، کہا مان نہ پڑھ
جن کو ملنی ہو، اُنھیں پہلے ہی مل جاتی ہے بس دِکھاوے ہی کے ہوتے ہیں یہ فرمان نہ پڑھ

عمر: کوشش جاری رکھیں۔ دن بدلتے دیر نہیں لگتی۔ وہ روزی رساں ہے۔ ضرور کوئی راہ نکلے گی۔

عمیر: جس تن لاگے، سوتن جانے۔ جب میں اپنے جیسے لاتعداد نوجوانوں کو بے روز گاری کے کے شکنجے میں جکڑے دیکھتا ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔

عمر: یار! ہمارے کالجز اور یونیورسٹیز تو شاید بے روز گار پیدا کرنے کی مشینیں ہیں ہر سال جتنے لوگ نکلتے ہیں اُن کی سرکاری یا نجی اِداروں میں کھپت ممکن نہیں۔ اس کی بجائے ہمیں فنی تعلیم یا ذاتی کاروبار کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

عمیر: لیکن فنی تعلیم ہر ایک کا مزاج نہیں ہوتا اور ذاتی کاروبار کے لیے سرمایہ اور تجربہ کہاں سے آئے؟

عمر: بات تو آپ نے ٹھیک ہی کہی ہے۔ کہتے ہیں موجودہ حکومت نوجوانوں کو کاروبار کے لیے کچھ قرضہ جات کی خطیر رقم فراہم کر رہی ہے۔ شاید بہتری کی صورت نکل آئے۔

عمیر: وہ تو آنے والے دِنوں کی بات ہے۔ ایسی اصلاحات تو مستقبل کے لیے ہوتی ہیں۔ مجھے اب ضرورت ہے۔

عمر: منفی باتیں اور کم حوصلہ خیالات ذہن سے نکالو اور تن دہی سے کام لو۔ "تیز تر گام زن کہ منزل ما دور نیست۔"

عمیر: بہت بہتر۔ میں اب اللہ پر توکل کرتے ہوئے نئے سِرے سے کوشش کرتا ہوں۔

عمر: خدا تمھارا حامی و ناصر ہو

عمیر: آمین! ثُمّ آمین

اختتامی منظر: (دونوں دوست نئے عزم اور صالح جذبے کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں۔

۞۞۞۞۞۞

رشوت ستانی

منظر: (محسن اور احسان دیرینہ دوست ہیں۔ دونوں ذمہ دار اور باشعور شہری ہیں۔ بڑھتی ہوئی رشوت ستانی پر دونوں کو تشویش ہے)

محسن: السّلامُ علیکم احسان!

احسان: وعلیکم السّلام! محسن کیسے آنا ہوا؟

محسن: یار! میں کچہری گیا ہوا تھا۔ ڈومیسائل کی ضرورت تھی۔ سوچا واپسی پر آپ سے ملتا چلوں۔

احسان: شکریہ! آپ نے مجھ سے ملنے کا اہتمام کیا۔

محسن: ملاقات کم دل کی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا۔ آپ کے علاوہ کس سے شیئر کروں گا۔

احسان: کیوں کیا ہوا؟ دلِ نادان پر کیا گزری؟

محسن: یار ہمارے ملک کا دفتری نظام بہت بگاڑ کا شکار ہے۔ دفتری اہل کار تو سیدھے منہ بات بات ہی نہیں کرتے۔

احسان: یہ کوئی نئی بات نہیں۔ بزرگ بتایا کرتے تھے کہ قائدِ اعظم کی وفات کے بعد معاملہ بگڑنا شروع ہو گیا تھا۔

محسن: وہ کس طرح پر، اِس کی کیا وجہ تھی؟

احسان: بس یہی اپنی ذاتی خواہشات کو قومی تقاضوں سے بڑھ کر جاننا۔

محسن: کیا شروع ہی سے ایسا ہوتا رہا ہے؟

احسان: ہاں جب مہاجرین کو زمین الاٹ ہوتی تھی ہر ایک سے کلیم پر پانچ روپیہ رشوت لی جاتی تھی۔ بہت سے زمیندار تو بے زمین ہو گئے کیونکہ روپیہ ادا کرنے کی سکت نہ رکھتے تھے۔

محسن: کیا سب سے رشوت طلب کی جاتی تھی اور تمام افسر یا ماتحت اس کام میں ملوّث تھے؟

احسان: نہیں سب تو نہیں لیکن اکثریت اس دلدل میں پھنسی ہوئی تھی یا طاقت اور سفارش بچاؤ

کا طریقہ تھا۔

محسن: یار یہ ملک تو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔تو پھر یہ غیر اسلامی روِش کیا تھی؟

احسان: ہم نام کے مسلمان ہیں۔عمل سے دُور۔اسلام تو فریقین کو پابند کرتا ہے:

''رِشوت دینے والا اور رِشوت لینے والا دونوں جہنمی ہیں۔''اِس کے باوجود یہاں رشوت کا چلن عام ہے۔

محسن: دوست! یہاں تو ہر تھانہ، کچہری، واپڈا کا دفتر، ہر جگہ رشوت کا دھندہ چلتا ہے۔

احسان: پہلے پہل تو کچھ کام بغیر رِشوت کے بھی ہو جاتے تھے۔مگر روز بروز معاملہ خراب ہوتا چلا گیا۔

محسن: بڑے بڑے لیڈر اور اُن کے حواری دولت کی دوڑ میں سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔نظام کے بگاڑ نے معاملہ کچھ سے کچھ کر دیا ہے۔

وقت نے نوچے ہیں کیسے کیسے چہروں سے نقاب
راہزن نکلا تھا جو تھا رہنما ٹھہرا ہوا

احسان: اِس کا علاج دیانت دار قیادت، باصلاحیت صالح بیوروکریسی اور ذمہ دار شہریوں سے ممکن ہے۔

محسن: یہ کیسے ممکن ہے؟

احسان: یہ انقلاب تعلیمی نظام، تبلیغی کوششوں اور نظامِ عدل کی بہتری سے ممکن ہے۔

محسن: ہمیں امید کا دامن تھامے رکھنا چاہیے۔اللہ پاک بہتری کی صورت پیدا کریں گے۔

قعرِ دریا میں بھی آ نکلے گی سورج کی کرن
مجھ کو آتا نہیں محرومِ تمنّا ہونا

اب رُخصت چاہتا ہوں۔یار زندہ صحبت باقی۔

احسان: خدا حافظ۔فی امانِ اللہ۔

اختتامی منظر (دونوں دوست بہت خوش خوش جدا ہوتے ہیں۔)

❁❁❁❁❁❁

احترامِ اُستاد

(دو دوستوں کے درمیان مکالمہ)

تمہیدی منظر نامہ (حامد اور محمود ہم جماعت ہیں۔ لیکچر ختم ہوا اور بریک کی بیل ہوئی۔ دونوں دوست کمرۂ جماعت سے اُٹھے اور کیفے ٹیریا کی جانب چلے۔ کالج ہال میں چلتے چلتے اُنھوں نے دیکھا کہ ایک طالب علم اُستاد سے بدتمیزی کر رہا ہے۔ جس پر حامد محمود سے مخاطب ہوا۔)

حامد: یار محمود! دیکھو تو کتنا بدتمیز لڑکا ہے۔

محمود: اپنا نقصان کر رہا ہے۔ اُستاد کا کیا لیتا ہے؟

حامد: اقبال کا مصرع یاد آیا: ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں۔

محمود: واقعی! کہتے ہیں: ''جو اُستاد کی عزت نہیں کرتا کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ باادب بامُراد، بے ادب بے مراد۔

حامد: آپ نے دیکھا ہوگا جو شاخ جھک جاتی ہے وہی پھل دار ہوتی ہے۔ صراحی جھک کر ہی پیمانہ بھرا کرتی ہے۔

محمود: میرے ابا جان کہا کرتے ہیں: ''استاد کا احترام فرض ہے۔ جو اُس کا احترام نہیں کرتا وہ علم نہیں محض ''رٹا'' ہے۔ حفظِ بے معرفت۔

حامد: رسولِ پاک ﷺ نے خود کو معلّم فرمایا اور صحابہ آپؐ کا اِس قدر احترام کرتے تھے کہ یہ نظارہ چشمِ فلک نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سانپ ڈس لے مگر حضورؐ کے آرام میں خلل نہ آئے۔

محمود: ہمارے اسلاف تو اُستاد کے بڑے قدردان رہے ہیں۔ حضرت علیؓ کا فرمان ہے ''جس شخص سے میں نے ایک لفظ بھی پڑھا میں اُس کا غلام ہوں۔ چاہے وہ مجھے بیچ دے یا آزاد کر دے۔''

حامد: تاریخ کے اوراق ایسے سنہرے حروف سے بھرے پڑے ہیں۔ خلیفۂ وقت ہارون الرّشید حدیث پڑھنے کے لیے معلّمِ وقت امام مالکؒ کے در پر تعظیماً حاضر ہوتے تھے۔ آقا اور

غلام میں کوئی فرق نہ تھا۔

محمود: لیکن سکھانے اور پڑھانے کا کام دنیا کے تمام کاموں سے مشکل کام ہے۔ یہ انسان سازی اور معاشرہ سازی کا عمل ہے۔ اُستاد اور شاگرد کا رشتہ ایک روحانی رشتہ ہے جو دل کے گرد گھومتا ہے اور دل کی دُنیا محبت وارادت کی کہکشاں سے نکھرتی ہے۔

حامد: ایک دفعہ میں نے سنا تھا: ''محبت کا پرندہ دل کی شاخ پر بیٹھتا ہے۔'' استاد باغبانِ ریاضِ نجات ہے۔

محمود: آپ نے سنا ہوگا کہ سکندرِ اعظم اپنے اُستاد کا بے حد احترام کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا: ''میرا باپ مجھے آسمان سے زمین پر لایا، جب کہ میرا اُستاد ارسطو مجھے زمین سے پھر آسمان پر لے گیا۔'' ایک حیاتِ فانی کا باعث ہے اور دوسرا حیاتِ جاوِدانی کا رہنما۔

حامد: مگر یار محمود! یہ تو اسلاف کی باتیں ہیں۔ ہمارے معاشرے میں استاد کا وہ مقام نہیں جس کا وہ حق دار ہے۔

محمود: ہماری اخلاقی پستی کا بھی یہی سبب ہے۔ معیارِ تعلیم روز بروز گرتا جا رہا ہے۔ املاء غلط ہے۔ لُغت خراب۔ خط بدخط۔ ''ج'' اور ''خ'' میں تمیز نہیں۔ ''جبر'' کو ''خبر'' اور ''ثالث'' کو ''سالس'' لکھنا معمول کا واقعہ ہے۔

حامد: ہمارے ہاں علم کی قدر نہیں تو اہلِ علم کی توقیر کون کرے۔ ایک دل چسپ واقعہ سُنیے۔ کہتے ہیں ایک اُستانی اپنی شاگردہ کو پڑھا رہی تھی۔ اُس نے اُسے سبق یاد کرایا۔ وزیرِ تعلیم۔ وزیر تعلیم۔ وزیرِ تعلیم۔ جب دوسرے دن آموختہ سنانے کو کہا تو بچی نے پڑھ دیا ''زیرِ تعلیم۔'' اُستانی شگفتہ مزاج تھی۔ اُس نے کہا: ''بیٹی! جب ''زیرِ تعلیم'' کو ''ووٹ'' کی پہلی ''و'' لگ جائے تو وہ ''وزیرِ تعلیم'' بن جاتا ہے۔'' ووٹ کی عزت کے ساتھ علم کی بھی قدر کرنا ہوگی۔

محمود: واہ! واہ! خوب کہی۔ حضرت علیؓ کے قول کا مفہوم ہے: ''علم معزز لوگوں میں وجہِ عزت ہوتا ہے اور جاہلوں میں وہی علم توہین کا باعث ہوتا ہے۔'' جس طرح پانی کا قطرہ سانپ کے

مُنہ میں جا کر زہر بن جاتا ہے اور وہی قطرہَ آب ''صدف'' میں داخل ہو جائے تو موتی ہو جاتا ہے۔
مقام، مرتبہ اور ظرف کی بات ہے۔

حامد: تاریخ میں ہے کہ ہارون الرشید نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ کے لیے جاحظ کو اتالیق مقرر کیا تھا۔ ایک دن خلیفہ نے دیکھا کہ اُستاد پڑھا کر جانے لگے تو دونوں شہزادے (امین اور مامون الرّشید) اُٹھے اور اُستاد کے جوتے اُٹھانے کی کوشش کی۔ بے قراری کا عالم تھا۔ دونوں کے ہاتھ ایک ایک پاؤں کا جوتا آیا۔ دوسرے دن ہارون الرّشید نے اپنے درباریوں سے پوچھا: ''دُنیا میں سب سے خوش نصیب کون ہے؟'' درباریوں نے بے ساختہ کہا: ''آپ سے زیادہ کون ہوگا!'' کہا: ''نہیں، سب سے زیادہ خوش نصیب اور قابل قدر وہ شخص ہے دونوں شہزادے جس کے جوتے اُٹھانے کی آرزو کرتے ہوں۔''

محمود: واقعی! اُستاد کا احترام لازم ہے۔ وہ قابل قدر ہے۔ غربت میں رہتا ہے مگر عزت سے جیتا ہے۔

اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

شیخِ مکتب ہے اِک عمارت گر جس کی صنعت ہے روحِ انسانی

اختتامی منظر: (گھنٹی بجتی ہے۔ تفریح کا وقت ختم ہوتا ہے۔ دونوں اپنی کلاس کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں)

مہنگائی ...... حالاتِ حاضرہ

(دو دوستوں کے درمیان مکالمہ)

منظر: (عدنان اور حمید دونوں دوست کچھ عرصہ بعد ملتے ہیں۔ دونوں باشعور شہری ہیں اور حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔)

عدنان: کیسے ہیں حمید بھائی! آج کل نظر نہیں آتے۔ نصیبِ دُشمناں طبیعت ناساز تو نہ تھی؟

حمید: میں بالکل تندرست ہوں بس مصروفیات کچھ بڑھ سی گئی تھیں۔ اِدھر آنا ہی نہیں ہوا۔

عدنان: موجودہ دَور میں دوستوں کے لیے وقت نہیں رہا۔ زمانے نے کیا رنگ دِکھائے ہیں!

حمید: ''بدل دیا حالات نے مجھ کو، تیرا جہاں آباد رہے۔'' فرصت اور فراغت اب قصۂ ماضی معلوم ہوتی ہیں۔

عدنان: ہاں، واقعی بہت کچھ بدل گیا ہے۔ نہ صرف ملکی بلکہ عالمی سطح پر تیزی سے تبدیلیاں آ رہی ہیں۔

حمید: آمدنی قلیل اور مہنگائی حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ ہر شخص پریشان ہے۔ آٹا اور چینی پہنچ سے باہر ہیں۔

عدنان: کبھی سبزمنڈی جا کر تو دیکھو کیا قیامت ڈھا رکھی ہے مہنگائی نے۔ ٹماٹر، سبز مرچ اور آلو ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔

حمید: حکومت کو لوگوں کی بالکل پروا نہیں۔ ''تیرے امیر مال مست'' والا معاملہ ہے۔ پی ڈی ایم والے شاید کچھ کر گزریں۔

عدنان: وہ کیا کریں گے؟ ہر کوئی اپنی اپنی باری بھر چکا ہے۔ کہتے ہیں بھٹو کے زمانے سے قبل چینی سوا روپیہ کلو، گندم سو روپیہ میں آٹھ من، بکرے کا گوشت چار روپے کلو اور ڈالر کی قیمت پونے چار روپے کلو تھی۔ اُن کے آنے کے بعد ڈالر ساڑھے گیارہ روپے کا ہو گیا۔ پھر جو بھی آیا ''ہر کہ آمد عمارت نو ساخت۔''

حمید: (آہ بھر کر) جب تفکرات بڑھ رہے ہوں گے تو معاشرے کو کارآمد شہری کیسے میسّر آئیں گے؟

عدنان: ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ یہاں دولت کی غیر مساوی تقسیم رہی ہے۔ یہاں دو طبقے پیدا ہو گئے ہیں، حاکم اور محکوم:

تمہاری باندیاں بھی ریشمی تھانوں میں تلتی ہیں ہماری بیٹیوں کے تن کی عریانی نہیں جاتی

حمید: اس کلچر کے سبب دولت کی دَوڑ لگ گئی، حرام اور حلال کی تمیز اُٹھ گئی۔ اقربا پروری، رشوت ستانی اور بدعنوانی راہ پا گئی۔ جو بنا، جیسے بنا، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یعنی ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے۔

عدنان: تبصرہ تو سب بہت خوب کرتے ہیں، حل کوئی نہیں بتاتا۔ اصلاحِ احوال کی تدبیر تو ضروری ہے۔

حمید: وطنِ عزیز وسائل سے بھرپور ملک ہے۔ اِس میں چار بڑے موسم ہیں۔ ذہین لوگ بھی ہیں۔

عدنان: پھر مسئلہ کیا ہے؟ وسائل کے باوجود مسائل کی کثرت، کچھ سمجھ نہیں آتی۔

حمید: اِس میں ہمارا بھی قصور ہے۔ سر سیّد احمد خان نے لکھا ہے: ''یہ ایک نیچر کا قاعدہ ہے کہ جیسا مجموعہ قوم کی چال چلن کا ہوتا ہے، یقیناً اُسی کے موافق اُس کے قانون اور اُسی کے مناسب حال گورنمنٹ ہوتی ہے۔''

اگر نیت کا قبلہ درست ہو تو بات بن سکتی ہے۔ جو اپنے لیے کچھ نہیں کرتا کوئی اُس کے لیے کچھ کیوں کرے؟

عدنان: خوب کہی۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔

حمید: بھروسا بہت ضروری ہے مگر قرآنِ پاک میں اِرشاد ہے: ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ۔

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

عدنان: اجازت دیجیے، اللہ حافظ!

حمید: اللہ حافظ! یار زندہ صحبت باقی۔

☆☆☆☆☆☆

گداگری ایک لعنت

منظر: (امجد اور ماجد دونوں گہرے دوست ہیں۔ دونوں امجد کے گھر کے دیوان خانے میں بیٹھے دسمبر ٹیسٹ کی تیاری کر رہے ہیں۔ باہر سے پاٹ دار آواز آتی ہے:''کچھ دو اللہ کے نام پر)

ماجد: یار امجد! دیکھو باہر کون آیا ہے؟ یہ توانا آواز کس کی ہے؟

امجد: یار! یہ ہر منگل کو آتا ہے۔ ہر روز کسی نہ کسی محلے میں جاتا ہے اور بھیک مانگتا ہے۔

ماجد: لوگ اِس ہٹے کٹے فقیر کو خیرات اور صدقات دے دیتے ہیں، بڑی بات ہے۔

امجد: تم اِس ایک فقیر کی بات کرتے ہو، یہاں تو طرح طرح کے لوگ آ کر بھیک مانگتے ہیں۔ کوئی صبح کو، کوئی شام کو۔ منگل اور جمعرات کو تو تانتا بندھا رہتا ہے۔

ماجد: یار! انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اللہ پاک نے اسے اچھی صورت دی ہے اور اچھی سیرت بھی۔ اسے تو در در کا ہونے کی بجائے ایک در کا ہو جانا چاہیے۔ اس سے مانگے جو سب کو دیتا ہے۔

امجد: یہ لوگ پیشہ ور گداگر ہیں۔ یہ کمائی کا آسان ترین ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

ماجد: یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

امجد: بھئی! جیسے جیسے آبادی بڑھتی جائے گی ویسے ویسے ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگا۔ اور ان میں تو کچھ زیادہ ہی ہو رہا ہے۔

ماجد: کچھ زیادہ نہیں، بلکہ بہت زیادہ کہیے۔

امجد: ہاں بہت زیادہ۔ ان مانگنے والوں میں بہت زیادہ تعداد تو مسلمانوں کی ہوتی ہے۔

ماجد: اسلام تو گداگری کی سخت مذمّت کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے: ''سوال مت کرو۔'' اور پھر فرمایا: ''اگر کوئی گداگر مجھ سے وعدہ کرے کہ وہ بھیک نہیں مانگے گا تو میں اُسے جنت کی بشارت دوں گا۔''

امجد: واہ! کیا خوب صورت اِرشادات ہیں! مگر پھر بھی یہ اپنی رَوِش ترک نہیں کرتے۔ کیوں؟

ماجد: اوّل تو اسلام کے مطابق عمل یہاں خال خال ہی نظر آتا ہے۔ اسے ہم نے عقائد اور زیادہ سے زیادہ عبادات تک محدود کرلیا ہے۔ معاش اور اخلاق سے بے دخل کرلیا ہے۔ جب کہ اسلام زندگی کے ہر لمحے اور عمل کے ہر پہلو میں نفاذ کا تقاضا کرتا ہے۔

امجد: انھیں اپنی عزت کی پروا بھی نہیں ہوتی جب کہ ''غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دَو میں۔''

ماجد: یہ پیشہ ہمارے مذہب میں، ہمارے اسلاف اور روایت میں ہمیشہ ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہمارے اسلاف کے طرزِ عمل کا نقشہ اقبالؒ کے شعر میں ملاحظہ ہو: شانِ امارت میں ''الفقرُ فخری'' کا سماں پیشِ نظر تھا اور:

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اِتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

امجد: افسوس ہمارے ہاں گداگری ایک منظم پیشہ بن گئی ہے۔ اس کی تربیت کے باقاعدہ اڈے ہیں۔ اندھیروں کے یہ مسافر اندھیروں میں رہتے ہیں اور بھیانک گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔

ماجد: اِس میں صرف اُن کا نہیں بلکہ ہمارا بھی قصور ہے۔ ہم بھی بھوکوں کو کھانا کھلانے اور حق داروں کو اُن کا حق دینے کی بجائے، رحم کی خود فریبی میں مبتلا ہو کر اُن کو خیرات دیتے ہیں۔ ہماری اِس سخاوت کے جذبے سے دوہرا نقصان ہوتا ہے۔ ایک طرف حق دار محروم ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف اِن پیشہ وروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

امجد: میں آپ کو اِس معاملے میں ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ ہمارے پروفیسر صاحب نے سُنایا تھا۔ کہتے تھے: ''میرا بیٹا نعمان اُن دِنوں ایک اِشارے پر لاہور شہر میں ڈیوٹی کر رہا تھا۔ اُن دِنوں تنخواہ معقول تھی۔ اِشارہ بند ہوا۔ ایک کالے رنگ کی نئی نویلی مہنگی

گاڑی، جس میں ایک امیر خاتون بیٹھی ہوئی تھیں، رکی۔ ایک فقیر آگے بڑھا۔ بی بی جی کو سلام کیا، ہاتھ ماتھے پر رکھا۔ اُنھوں نے پرس کھولا۔ دو نوٹ سو سو روپے کے پرس سے نکال کر اُس کے حوالے کر دیے۔ اِشارہ کھلا، گاڑی تیزی سے آگے کو نکل گئی۔ نعمان نے ساتھی ملازم دوست سے کہا: ''یار! وردی اُتاریں اور اِس کام پر لگ جائیں۔ کتنا آسان ذریعۂ معاش ہے۔''

ماجد: واہ! کیا دل چسپ واقعہ ہے۔ بھئی! سرکاری سطح پر اِس کو بند کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کو بند کرنا معاشی خوش حالی کے لیے بھی ضروری ہے۔

امجد: چلو! اللہ پاک سے دعا کریں کہ کوئی بہتری کی صورت پیدا ہو۔ **لا تقنَطُوا مِن رّحمةِ اللہ۔**

اختتامی منظر: (دونوں دوست دوبارہ اپنی پڑھائی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔)

☆☆☆☆☆☆

ہم نصابی سرگرمیاں

منظر: (احسن اور محسن جانی یار ہیں۔ بااعتماد اور بے تکلّف دوست۔ احسن کتاب کا رسیا اور محسن کھیلوں کا دلدادہ)

محسن: السلامُ علیکم! کیا حال ہے؟
احسن: وعلیکم السّلام۔ الحمد للہ۔ اللہ کا شکر ہے۔
محسن: پھر وہی کتابوں کی دُنیا سجا رکھی ہے۔ کبھی کبھار کھیل کود بھی لیا کرو
احسن: بس یار! سبق یاد کر رہا ہوں۔ یاد ہی نہیں ہو رہا۔
محسن: تھوڑا تھوڑا پڑھا کرو تا کہ جلدی یاد ہو جائے۔ اور پختہ بھی۔
احسن: تھوڑا یاد کر کے کورس کیسے ختم ہو گا؟ COVID-19 کے سبب تو بہت سا وقت ضائع ہو گیا ہے۔
محسن: تمھیں معلوم نہیں کہ حکومت نے سمارٹ کورس کر دیا ہے۔ اب تو سارا پڑھنے کا فائدہ ہی نہیں۔
احسن: پھر بھی یاد تو کرنا ہی پڑے گا نا! تھوڑے تھوڑے سے مسئلہ کیسے حل ہو گا؟
محسن: سُنا نہیں؟ ''اگر تھوڑا تھوڑا کرو صبح و شام۔ بڑے سے بڑا کام بھی ہو تمام۔ قطرہ قطرہ مل کر دریا بنتا ہے۔
احسن: اچھا بابا! تمھاری بات مان لیتے ہیں۔ بتاؤ کیا کریں؟
محسن: آؤ میدان میں کرکٹ کھیلیں اور کیا۔
احسن: کھیلنے سے وقت ضائع ہوتا ہے۔ پڑھائی سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ تکان اور بوریت الگ۔
محسن: کھیل تو فطرت ہے۔ بچہ پڑھنے سے پہلے کھیلنا سیکھتا ہے۔ ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ گِر گِر کر سنبھلتا ہے۔ اس کی معصومانہ ادائیں سب کے دامن دل کو کھینچتی ہیں۔ وہ پہلے دن کتاب تھوڑی پکڑتا ہے۔

احسن: بعد میں تو کتاب کی طرف آنا ہوتا ہے۔ جو اُسے زندگی گزارنے کا سبق سکھاتی ہے۔ ذریعۂ معاش بنتی ہے۔

محسن: ذریعۂ معاش! کیا خوب کہی۔ ذریعۂ معاش تو کھیلیں بھی بنتی ہیں۔ جتنی دولت کھلاڑی کماتے ہیں وہ بے چارے کلرکوں اور مزدوروں کے نصیب میں کہاں؟

ہیں بہت تلخ بندۂ مزدور کے اوقات

احسن: تعلیم اور کتابیں انسان کو نظم وضبط سکھاتی ہیں۔ تہذیب وتمدّن کا پتا چلتا ہے۔

محسن: قواعد وضوابط کی پابندی جتنی کھیل کے میدان میں نظر آتی ہے، کمرۂ جماعت میں کہاں؟ کپتان میں انتظامی سوجھ بوجھ اور کھلاڑیوں میں اطاعت شعاری قابل رشک ہوتی ہے۔

احسن: میں کھیل کی افادیت سے انکار تو نہیں کرتا مگر ہر وقت کھیل کھیل کی تکرار مجھے اچھی نہیں لگتی۔

محسن: تم ٹھیک کہتے ہو۔ دونوں چیزیں اپنے اپنے وقت پر مناسب ہوتی ہیں۔ علم وعرفان کتابیں عطا کرتی ہیں اور صحت و ورزش فکر میں شگفتگی لے کر آتی ہیں۔ "A sound mind is in a sound body."

احسن: اب تو کھیل کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ یہ تو باقاعدہ نصاب کی تعریف میں شامل ہے۔ تمام سرگرمیاں چاہے کلاس روم میں ہوں یا کھیل کے میدان میں، نصابِ تعلیم کہلائیں گی۔

محسن: چلو! تم مان تو گئے نا! اب میں چلتا ہوں۔ اللہ حافظ!

احسن: اللہ حافظ!

اختتامی منظر: (محسن رخصت ہوتا ہے اور احسن پھر ورق گردانی میں محو ہو جاتا ہے۔)

چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ ''کافر'' لگی ہوئی

☆☆☆☆☆☆